برائے پبلک لائبریری خانیار سرینگر
نند کشور کی طرف سے
مئی
91

پرکٹی تتلی

(ناول)

ہنسراج رہبر

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز

جے۔ ۶۔ کرشن نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

پر کٹی تتلی

(ناول)

سال اشاعت ۔ ۱۹۸۱ء

مصنف : ہنسراج رہبر

مطبع : نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی

پرنٹر : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ج ۶۔ کرشن نگر دہلی ۵۱

آرٹسٹ سرورق : نریش کمار

قیمت : تیس روپے

کتابت ابوبکر قاسمی

ناشر ہنسراج رہبر

PAR KATI TITLI (NAVEL)

Price Rs. 30/-

نند کشور وکرم کے نام

اپنی بات

میں نے یہ ناول ایمرجنسی کے دوران انبالہ سینٹرل جیل میں لکھا تھا۔ گرفتاری سے کچھ روز پہلے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ :-

"ایک دوشیزہ جس کی عمر تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ برس ہے صبح سویرے مراند اہاؤس کے پاس سڑک کے کنارے بے ہوش ملی۔"

میں اس خبر کو بنیاد بنا کر ناول لکھنے کی سوچ رہا تھا جیل میں اس کے لئے کافی فرصت تھی۔ میں نے ایک پلاٹ بنایا، اس کے مطابق کردار تخلیق کئے اور ناول لکھنے کا تہیہ کر لیا۔

کوئی واقعہ یا واردات اچانک ظہور میں نہیں آجاتی اور نہ وہ مجرد ہوتی ہے اس کا موجودہ سماج سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ کسی رجحان خاص کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس لئے کسی واقعہ یا خبر کو بنیاد بنا کر ناول لکھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے نمک مرچ لگا کر قارئین کے لئے دلچسپ اور مزیدار بنا دیا جائے۔ مصنف کا فرض قارئین کی رغبت کی پیروی کرنا نہیں بلکہ اسے ارفع بنانا ہے۔

قاری کی رغبت تبھی ارفع ہوگی جب ناول نویس اس کے شعور کے معیار کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ شعور کا معیار اونچا اٹھانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ پلاٹ اور کرداروں کی مدد سے سماج کا تجزیہ کرے اور اس واقعہ کے پیچھے جو رجحان کارفرما ہے اسے بخوبی اجاگر کیا جائے اگر وہ رجحان صحت مند اور مفید ہے تو قاری کے من میں اس کے تئیں عقیدت، اور اگر رجحان بیمار اور مضر ہے تو نفرت جگائی جائے۔

میرے خیال میں ادب کا مقصد یہی ہے اور ادیب اس مقصد کو تبھی پورا کر سکتا

ہے جب وہ خود سماج کا ترجمان ہونے کی اپنی ذمہ داری کو بخوبی سمجھے اور پھر اس ذمے داری کو ایمانداری اور تندہی سے نبھائے۔ ادب سماج کا آئینہ بھی تبھی بنتا ہے۔

میں نے یہ ناول اس مقصد سے لکھا ہے بلاشبہ میں نے اسے قاری کے لئے دلچسپ بنانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اصل مقصد موجودہ سماج کا تجزیہ کرنا اور اس کے متضاد رجحانوں کو اجاگر کرنا ہے، سماج کا ماضی ہوتا ہے روایت ہوتی ہے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل بنتا ہے ماضی اور روایت کو جھٹلانے والا رجحان بلاشبہ غیر صحت مند مضر ہے مستقبل کی راہ ہموار کرنے والا صحت مند رجحان بیمار رجحان سے مغلوب ہے کیوں مغلوب ہے؟ شائد قاری کو اس ناول سے یہ بات سمجھنے میں بھی مدد ملے۔

ہنسراج رہبر
نوین شاہدرہ دہلی ۳۲

ماہر اقتصادیات ڈاکٹر تیاگ راج نے اپنی اخروٹ کی چھڑی اٹھائی اور وہ ٹہلنے کے لئے کوٹھی سے باہر نکلے۔ سڑک پر پو پھٹنے کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا، ہوا میں خنکی تھی اور نمی بھی۔ پانی متواتر دو دن برسنے کے بعد رات کے نو دس بجے تھما تھا۔ اب کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے گھر سے روٹھ کر آئے آوارہ بچوں کی طرح ادھر ادھر منڈلا رہے تھے ورنہ آسمان بالکل صاف ستھرا تھا۔ تارے دور دور تک چھٹکے ہوئے تھے جو سویرا ہو جانے کے باعث چمک دمک کھو بیٹھے تھے اور رفتہ رفتہ مدھم پڑتے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے رات ریڈیو پر سنا تھا کہ جون سے اب تک "۶۵ء۶۲" بارش ہو چکی ہے اور پچھلے دس گیارہ برس میں اتنی زیادہ بارش کبھی نہیں ہوئی۔ انسان قدرت کو سمجھنے اس پر قابو پانے کا لاکھ جتن کرے لیکن وہ اچانک اپنا غیر معمولی کرشمہ دکھا کر اس کے سارے اندازوں کو جھٹلا دیتی ہے۔ ستمبر آدھا بیت چکا تھا پھر بھی پانی تھمنے میں نہیں آ رہا تھا بادل امنڈ گھمنڈ کر آتے تھے اور موسلا دھار مینھ برسنا شروع ہو جاتا تھا۔

کچھ بارش اور کچھ بڑھاپے کے باعث ڈاکٹر تیاگ راج نے لسکٹی رنگ کا سویٹر پہن لیا تھا اور سر پر سموری ٹوپی تھی، متواتر مینھ برستے رہنے کے باعث وہ دو دن تک کوٹھی سے باہر نہیں نکل سکے تھے ورنہ اس عمر میں بھی جب تک صبح سویرے دو ڈھائی میل گھوم نہیں آتے تھے انہیں چین نہیں پڑتا تھا۔ کبھی ناغہ ہو جائے تو تمام دن ایک کمی، ایک خلا سا محسوس ہوتا رہتا تھا۔ دو دن کمرے میں بند رہنا پڑا تو دل بہت سٹپٹایا اور اب وہ مقررہ وقت سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی گھر سے نکل پڑے تھے۔

روپ نگر سے نکل کر موریس نگر ہوتے ہوئے وہ مال روڈ پر پہنچ گئے۔ تب بھی اندھیرے اور اجالے میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی، ابھی تانگے اور بسیں وغیرہ چلنا شروع

نہیں ہوئی تھیں۔ اور کوئی آتا جاتا آدمی بھی دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ راستہ ان کا دیکھا بھالا تھا وہ اپنے آپ میں کھوئے کھوئے سے محض اندازے سے چل رہے تھے۔ مرانڈا ہاؤس سے وہ دس بیس قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ بھونچکے رہ گئے، جو کچھ دیکھا اس پر انھیں یقین نہیں ہو رہا تھا۔

" لڑکی ! "

وہ کچھ دیر یونہی کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر اپنی سنہری فریم کی عینک اتاری اسے رومال سے اچھی طرح صاف کیا اور دوبارہ لگا کر غور سے دیکھا۔ انہیں کسی طرح کا دھوکا نہیں ہوا تھا۔ شیشم کے پیڑ تلے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔

وہ جھکے سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالی اور اس کے ہر عضو کا جائزہ لیا ٹھوکر لگنے کے بعد بھی وہ ہلی جلی نہیں جیسے پہلے لیٹی تھی اسی طرح بے سدھ لیٹی رہی۔ "شاید کوئی مار کر اس کی لاش یہاں پھینک گیا ہو۔"

انہوں نے سوچا لیکن وہ اس خیال پر ٹک نہیں پائے کیوں کہ ان کی تجربہ کار آنکھوں کو موت کی بھیانک پرچھائیں کہیں بھی دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔ مردے کا جسم کالا پڑ جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں اینٹھ جاتے ہیں۔ وہ جانے کب سے یہاں پڑی تھی لیکن اس کے جسم پر کوئی بھی ایسی علامت نہیں تھی۔ چہرے پر مردنی کے بجائے تازگی تھی اور لانبی گھنی پلکیں دیکھنے سے لگتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

وہ جھکے جھکے لڑکی کے خوبصورت سڈول جسم کی طرف دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔ پھر وہ اپنی ہتھیلی اس کی ناک کے قریب لے گئے، معلوم ہوا کہ سانس بدستور چل رہی ہے اور سانس میں گرماہٹ ہے اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی وہ یقینی طور پر زندہ تھی اور کسی کارن بے ہوش ہو گئی تھی۔

لڑکی نے گہرے رنگ کا سکرٹ اور پوری باہوں کا سیاہ رنگ کا ٹاپ پہن رکھا تھا اور گلے میں سکرٹ سے میچ کرتی ہوئی ہرے رنگ کی کنٹھی تھی جسم بھرا ہوا اور رنگ ایک دم گورا تھا، بدن پر نہ کہیں گھاؤ اور نہ کسی چوٹ کا نشان تھا۔

"معاملہ کیا ہے؟ وہ یہاں آئی کیسے؟" ان کے لئے کچھ بھی سمجھ پانا ممکن نہیں تھا وہ چند لمحے ساکت وصامت کھڑے دیکھتے رہے پھر سوچا "کیا میں اسے یوں ہی لیٹی،

چھوڑ چلا جاؤں ؟"

ڈاکٹر تیاگ راج شش و پنج میں پڑ گئے کریں تو کیا کریں ؟

وہ سوشل کام میں دلچسپی لیتے تھے ، دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا اور حتی الامکان مدد کرنا ان کی عادت بن چکی تھی ، ایک پڑھی لکھی لڑکی کو اس بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

آخر انہوں نے اپنا فرض پہچانا اور سڑک پار کر کے سامنے والی کوٹھی میں چلے گئے اس کوٹھی میں مجسٹریٹ رجونت سنگھ رہتا تھا جس سے ان کا اچھا میل جول تھا ، کوٹھی میں سناٹا چھایا تھا گھر کے سبھی افراد سوئے ہوئے تھے ویسے بھی اس روز اتوار تھا شاید اس لئے بھی دیر سے اٹھنے کا پروگرام ہو۔

سیس پال نام کا چوکیدار برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا ۔ اس نے آہٹ سنی ، ہڑبڑا کر اٹھا ، پل بھر نیند سے بھری آنکھوں سے ڈاکٹر تیاگ راج کی طرف دیکھتا رہا اور پھر انہیں پہچان کر پرنام کیا۔

"صاحب کو جگاؤں ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں انہیں سونے دو۔ مجھے ذرا فون کرنا ہے "

سیس پال ڈاکٹر صاحب کو فون والے کمرے میں لے گیا ۔ انہوں نے ڈائل گھمایا اور اپنی کوٹھی کا نمبر ملایا۔

"ہیلو ! "

"..... "

"کون ، نریندر ؟ "

"جی ہاں ، میں نریندر ہوں "

باپ نے بیٹے کی اور بیٹے نے باپ کی آواز پہچان لی تھی۔

"میں مال روڈ پر مجسٹریٹ رجونت سنگھ کی کوٹھی کے سامنے کھڑا ہوں ، تم کار لے کر فوراً وہاں پہنچ جاؤ "

"کیا بات ہے ؟ " نریندر نے گھبراہٹ اور فکر کے لہجے میں پوچھا۔

"بات تمہیں یہاں آکر معلوم ہو جائے گی ۔ جلدی کرو " ڈاکٹر تیاگ راج نے

ریسیور رکھا اور باہر نکل آئے۔

ستیہ پال بھی تجسس اور تعجب کے عالم میں ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ دونوں لڑکی سے چند قدم کے فاصلے پر پیڑ کے نیچے کھڑے تھے اور سڑک اب بھی سنسان تھی۔

نریندر کار لے کر دس بارہ منٹ میں آپہنچا۔ وہ چند لمحے کھویا کھویا سا بے ہوش دوشیزہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"یہاں پر کیسے آئی؟"

"کون جانے!"

"مردہ ہے یا بے ہوش؟"

"بے ہوش" ڈاکٹر نیاگ راج نے جواب دیا اور کہا۔ "میں نے دیکھ لیا ہے سانس چل رہی ہے۔"

کچھ لمحے خاموشی کے گذرے، باپ نے بیٹے اور بیٹے نے باپ کی طرف دیکھا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ ہم اسے ہسپتال لے جا کر ایمرجنسی وارڈ میں بھرتی کرا دیں۔" "کہیں چوٹ وٹ تو ہے نہیں ہسپتال لے جا کر کیا کریں گے؟" نریندر نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو؟"

"کوٹھی پر لے چلتے ہیں وہاں سے بھر رسین کو فون کر دیں گے۔ وہ آکر دیکھ لے گا"

"ٹھیک ہے۔ دیکھ جانچ کر وہ جیسا کہیگا پھر ویسا کر لیں گے۔"

ستیہ پال اور نریندر نے لڑکی کو اٹھا کر پیچھے والی سیٹ پر لٹا دیا۔ باپ اور بیٹا دونوں آگے بیٹھے اور کار چل پڑی۔

اجالا ہو چلا تھا لیکن سڑک اب بھی سنسان تھی صرف ستیہ پال نے کار کو موڑ پر گھومتے دیکھا۔

---

(۲)

ڈاکٹر نیاگ راج ملک کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات تھے۔ آٹھ دس سال تک نیشنل پلاننگ کمیشن کے ممبر رہ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ عمر تو ان کی چھیاسٹھ ستاسٹھ برس تھی لیکن اب بھی سرگرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ ملک کے اقتصادی مسائل پر ان کے مضامین اکثر اخباروں میں چھپتے رہتے تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی بولنے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کل ہند امن کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ایک سرکردہ ممبر اور بھارت روس میتری سنگھ کی دلی برانچ کے صدر تھے۔ ۱۹۶۲ء کے سرحدی جھگڑے سے پہلے جب بھارت اور چین کے آپسی تعلقات دوستانہ تھے تب وہ کل ہند بھارت چین میتری سنگھ کے بھی نائب صدر تھے، کئی مرتبہ بدیش گھوم آئے تھے اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے بائیں بازو کے مشہور دانشور تھے۔

ان کی بیوی سبھدرا کی عمر اس وقت ساٹھ کے قریب تھی، وہ بھی عوامی بہبود میں دلچسپی لینے والی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور ہر کام میں ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ جتیندر اور نریندر ان کے دو لڑکے تھے۔ جتیندر تعلیم سے فارغ ہوتے ہی کینیڈا چلا گیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ مستقل طور پر اب وہیں بس گیا ہے۔ گھر پر اب میاں بیوی، نریندر اور پان سنگھ نام کا ایک پہاڑی نوکر تھا۔

جب باپ بیٹا گھر پہنچے تو سبھدرا پان سنگھ کے ساتھ پھاٹک پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب سے ڈاکٹر صاحب کا فون آیا تھا وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ایسی کیا واردات ہو گئی جو فوراً کار لے کر آنے کو کہا ہے۔ سیر کو تو وہ ہر روز ہی جاتے تھے مگر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

کار اندر آئی اور ڈاکٹر تیاگ راج دروازہ کھول کر باہر نکلے تو سبھدرا نے اطمینان کی سانس لی لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خوبصورت جدید لڑکی کو گاڑی میں پڑی دیکھا تو وہ دنگ رہ گئیں۔ کچھ دیر ان کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ وہ حیرت زدہ دیکھتی ہی رہیں۔ کبھی پتی اور بیٹے کو اور کبھی اس لڑکی کو۔

"یہ کیا ہے ؟"

"لڑکی"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں لیکن ....."

"سنا نہیں بھگوان جب دینے پر آتے ہیں تو چھپر پھاڑ کر دیتے ہیں۔ تم کتنا چاہتی تھیں کہ گھر میں ایک لڑکی ہوتی تو کتنا اچھا رہتا۔ تمہاری یہ خواہش پوری ہوئی، تمہیں پالنے پوسنے کا جھنجھٹ بھی نہیں کرنا پڑا۔ اور بھگوان نے یہ جوان بیٹی بھیج دی۔"

ڈاکٹر تیاگ راج ظریف طبع آدمی تھے، انہوں نے مزاحیہ انداز میں اپنی بات کہی اور بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

نریندر اور پان سنگھ نے دوشیزہ کو کار سے اتارا اور وہ اسے بڑی احتیاط سے اٹھائے اٹھائے اندر لے گئے۔

"کیا وہ زندہ ہے ؟" سبھدرا نے پوچھا۔

"ہاں زندہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

سونے کے کمرے میں لے جا کر لڑکی کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح بے ہوش اور بے خبر تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر سکون تھا۔ گیلی دھرتی پر پڑے رہنے سے سکرٹ اور ٹاپ سیل گئی تھیں۔ لیکن انھیں یونہی رہنے دیا گیا بے ہوشی کی اس حالت میں کپڑے بدل دینا ممکن نہیں تھا۔

بھدر سین ان کا ایک رشتے دار ڈاکٹر تھا۔ وہ قریب ہی شکتی نگر میں رہتا تھا اس کے پاس اپنی کار تھی۔ جب بھی ضرورت پڑتی تھی وہ اسے بلا لیتے تھے یعنی وہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ نریندر نے اسے فون کیا تو وہ سٹیتھو اسکوپ اور دوائیوں کا بکس لے کر کوئی آدھ گھنٹے میں وہاں آ پہنچا۔

بھدر سین کی عمر چالیس بیالیس برس تھی، قد درمیانہ، رنگ گورا، جسم سڈول اور

چھریرا گول مٹول تھا وہ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ ڈاکٹر ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔ اسے اسکول میں پڑھی "سلیپنگ بیوٹی" (خفتہ حسن) کہانی یاد آگئی۔ کمان جیسی پتلی بھویں، لانبی گھنی پلکیں، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک ہونٹ اور فن کارانہ ڈھنگ سے ترشا ہوا بلوری جسم، ڈاکٹر کی کلاس میں کئی لڑکیاں اس کے ساتھ پڑھتی تھیں: ایک سے ایک، خوبصورت، شوخ رو، نٹ کھٹ، یوں بھی اونچے گھرانوں، بیاہ شادی اور پارٹیوں میں جانے کتنی دوشیزاؤں اور مہیلاؤں کو دیکھا تھا لیکن یہ حسن لامثال تھا۔ گلے کی ہری کنٹھی اسے اور بھی جاذب نظر بنا رہی تھی جیسے کام دیو کی بیوی رتی راستہ بھول کر یا پھر بد دعا کے زیر اثر زمین پر اتر آئی ہو۔

"ڈاکٹر صاحب کیا سوچ رہے ہو؟" نریندر نے اسے کھویا کھویا سا دیکھ چٹکی لی۔

"میں سوچ رہا ہوں" بھدر سین نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ "رشیوں کا تپ بھنگ ہونے کی کہانیاں جھوٹ نہیں ہیں ——"

نریندر نے خاموش نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اپنے اندر ایک جھرجھری محسوس کی۔ حسن نسوانی سے اس نے جو بے رخی اختیار کر رکھی تھی وہ اس لامثال حسن کی تمازت سے خود بخود پگھل چلی تھی۔

بھدر سین اور نریندر پلنگ کے دائیں بائیں آمنے سامنے کھڑے تھے، دونوں کی نگاہیں بے ہوش دوشیزہ پر مرکوز تھیں۔ وہ چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے تھے کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے اور ایک جا رہا ہے۔ شاید وہ کوئی مضطر سپنا دیکھ رہی تھی۔ اس خفتہ حالت کی تصویر اگر کسی نے بنائی ہوتی تو اس کا شمار دنیا کے بہترین فن پاروں میں ہوتا۔

بھدر سین بھول گیا تھا کہ اسے دوشیزہ کو دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی تشخیص کے لئے بلایا گیا ہے۔ نریندر نے بھی اسے یہ احساس نہیں کرایا کیونکہ وہ بھی ایک ٹک دوشیزہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک تیاگ راج اور سبھدرا کمرے میں داخل ہوئے تب وہ دونوں چونکے ۔۔

بھدر سین نے اسٹیتھوسکوپ سنبھالا اور وہ مریضہ کی جانچ کرنے لگا، دل کی حرکت بالکل ٹھیک تھی۔ نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ وہ درست چل رہی ہے۔ گھنے سیاہ بال،

اٹھاکر سر کا معائنہ کیا اور کن پٹیوں کو ٹٹولا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ بیماری کی کوئی علامت کوئی نشان نہیں تھا۔ اور نہ کہیں ظاہر یا پوشیدہ چوٹ آئی تھی۔

"نیند کی بے ہوشی ہے تھوڑی دیر سو لینے کے بعد آپ ہی ٹوٹ جائیگی۔"

بھدرسین نے اپنی تشخیص کا اعلان کیا۔

"ہسپتال لے جائیں کہ نہیں؟" ڈاکٹر تیاج راج نے پوچھا۔

"گھنٹہ دو گھنٹے دیکھیئے۔ میرا خیال ہے وہ ہوش میں آ جائے گی۔ نہ آئے تو مجھے پھر فون کیجئے گا۔" بھدرسین نے جواب دیا۔

وہ کبھی ایک دوسرے کی طرف اور کبھی لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک عجیب حالت تھی۔

"لیکن اس نیند کا سبب کیا ہے اور وہ اس حالت میں سڑک پر آئی کیسے؟"

"یہ سب تو وہی بتا سکتی ہے۔" بھدرسین نے اپنا سامان سنبھالا اور بکسا بند کیا۔

"اچھا اجازت دیجئے۔ میں اب چلوں۔"

"ایسی کیا جلدی ہے تمہیں میرے ساتھ ناشتہ لینا ہوگا۔" نریندر بولا اور اس نے بھدرسین سے بکسا لے کر الگ رکھ دیا۔

نریندر کے بڑے بھائی جیتیندر کا بیاہ بھدرسین کی بہن سے ہوا تھا جو اس سے سات آٹھ برس چھوٹی تھی اور وہ بھی پتی کے پاس کینڈا چلی گئی تھی۔ ویسے بھی ان میں دو پشت سے خاندانی تعلق تھا۔ جو اس بیاہ سے اور گہرا ہو گیا تھا۔ نریندر اور بھدرسین میں اس تعلق نے دوستی کا روپ لے لیا تھا۔

ڈاکٹر تیاگ راج سیر سے لوٹنے کے بعد بورن وِیٹا کے ساتھ دودھ لیا کرتے تھے، جو وہ لے چکے تھے، اس لئے بھدرسین اور نریندر ناشتہ لینے بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ اس بے ہوشی کا سبب کیا ہے؟" نریندر بولا۔ وہ دراصل بھدرسین سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔

"کہہ تو دیا مجھے معلوم نہیں۔" بھدرسین نے جواب دیا اور نگاہیں نریندر کے چہرے پر گڑا دیں۔

"معلوم نہیں تم کیسے ڈاکٹر ہو؟"

"کیا تم مجھے ڈاکٹر کی بجائے نجومی سمجھتے ہو؟"

"اتنی گہری نیند کوئی چیز کھانے ہی سے آئی ہو گی۔ اس کا پتہ لگانا نجومی کا نہیں ڈاکٹر کا کام ہے۔"

"یہ پوسٹ مارٹم کے ذریعے ہی ممکن ہے کیا تم چاہتے ہو اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے؟"

بھدرسین نے کنکھیوں سے نریندر کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

پان سنگھ آکر آملیٹ، ٹوسٹ اور مکھن رکھ گیا۔ نریندر نے ایک پلیٹ بھدرسین کی طرف سرکا دی اور ایک اپنے آگے رکھ لی۔ دونوں نے ناشتہ اپنا شروع کیا۔

"کچھ اندازے ہی سے بتاؤ۔" نریندر پھر بولا۔

"اندازے سے انسان بھرم میں پڑ سکتا ہے بھرم پیدا کرنا ڈاکٹر کا فرض نہیں ہے"

بھدرسین نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے جواب دیا اور وہ سامنے کارنس پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔ برف ہی برف اور اوپر نیلا ــــ ایک دم نیلا وسیع آسمان۔

کیا یہ کشمیر کا منظر ہے؟"

نہیں۔ پتاجی یہ تصویر روس سے لائے ہیں۔"

قدرت کا اپنا حسن ہے جس کا جواب نہیں۔"

بھدرسین نے کہا اور چند لمحے خاموش نگاہوں سے تصویر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جو بات شروع کی وہ کشمیر، نینی تال، ڈلہوزی اور شملہ کے پہاڑی مناظر سے متعلق تھی اس کے بعد ناشتے میں جو وقت گذرا اس میں نریندر بھدرسین کے ساتھ پہاڑوں ہی کی سیر کرتا رہا۔ جب وہ اٹھ کر چلا تب بھی لڑکی کے بارے میں کوئی چرچا نہیں ہوئی۔ بھدرسین کا موڈ پہچان کر نریندر نے بھی اس بارے میں چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

---

(۳)

دوشیزہ کی بیہوشی اسی وقت ٹوٹ گئی تھی جب بھدر سین اسٹیتھسکوپ لگا کر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ آنکھیں موندے خاموش اور بے حس لیٹی رہی پہلے وہ واقعی بے ہوش تھی اور اس کے بعد بے ہوش ہونے کا ناٹک کرتی رہی، ناشتے کے دوران بھدر سین اور نریندر میں جو گفتگو ہوئی کمرے کے نزدیک ہونے کے باعث اس کی بھنک کانوں میں برابر پڑتی رہی تھی۔ بھدر سین کا یہ فقرہ کہ اندازہ بھرم پیدا کر سکتا ہے اس نے صاف سنا تھا۔

اس نے جب اپنے آپ کو کمرے میں اکیلا پایا تو آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا کر ہر ایک چیز کا جائزہ لیا اور اس سے گھر کی حیثیت کا اندازہ لگا لیا۔

اجنبی لوگ، اجنبی جگہ! ان نئے حالات میں اسے کیا رول ادا کرنا ہوگا۔ وہ من ہی من سوچتی رہی اور دیکھتی رہی۔

لڑکی کی عمر تئیس چوبیس برس تھی، اس چھوٹی ہی عمر میں وہ کئی تجربے کر چکی تھی اور ان تجربوں میں اس نے مختلف رول ادا کئے تھے، زندگی اس کے لئے ایک مسلسل تجربہ تھا۔ اور دنیا ایک تجربہ گاہ، اس نئے ماحول میں اچانک آجانا بھی تو ایک تجربہ ہی تھا۔ عجیب اور دلچسپ، دیکھنا یہ تھا کہ اس ماحول میں اس کا رول کیا ہوگا اور وہ اسے کیسے نباہ پائے گی اس کے لئے یہ امتحان کی گھڑی تھی، مزاتب ہے کہ اس کا رول اتنا ہی عجیب اور دلچسپ ہو۔ جتنا یہ ماحول معلوم ہوتا ہے وہ اپنا رول جتنی کامیابی سے نباہ کر پائے گی اور اس کی اداکاری جتنی کامیاب ہوگی وہ اس کے کامل عورت ہونے کا اتنا ہی بڑا ثبوت ہوگی

"کامل عورت! کامل عورت!"

دوشیزہ نے بلند آواز سے کہا اور وہ ان دو الفاظ کی بازگشت سن کر خوش ہوتی رہی جیسے وہ تان سین یا بیتھوون کے گائے ہوئے سنگیت کے مدھر بول ہوں۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ کھلکھلا کر ہنسے اور اجنبی ماحول کو قہقہوں سے لالہ زار بنا دے لیکن حالات کی سنجیدگی کے پیش نظر اس نے ہنسی کو اپنے اندر ہی دبا لیا۔ دبا لینے سے وہ مسکان سے زہر میں بجھی، عجیب مسکان میں بدل گئی۔

دوشیزہ نے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں اور وہ دوبارہ یوں ساکت وصامت لیٹ گئی کہ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ اس کی نیند ابھی ٹوٹی نہیں، وہ بدستور بے ہوش لیٹی ہے۔ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی، پھر وہ اچانک اٹھ بیٹھی، آنکھیں پوری کھول دیں اور اپنے لانبے لانبے سیاہ بالوں کو کندھوں پر پیچھے جھٹک کر ماحول میں یہ چیلنج پھینکا۔

"میں تم لوگوں کو ایسے بھرم میں ڈالوں گی کہ تمہارے لئے اس کا اندازہ لگانا ممکن، نہیں ہوگا۔"

اسی وقت سبھدرا نے کمرے میں قدم رکھا۔ انہوں نے لڑکی کو بیٹھے دیکھا اور بولتے بھی سنا لیکن یہ نہ سمجھ پائیں کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"بیٹی، تم جاگ گئیں؟ تمہارا جی اب کیسا ہے؟" سبھدرا نے شفقت کے لہجہ میں پوچھا

"ٹھیک ہے،" لڑکی نے چٹ پلنگ سے اتر کر ہاتھ جوڑے اور ادب سے پرنام کیا۔

سبھدرا کا قد لمبا اور جسم دبلا تھا انہوں نے نیلے بارڈر کی سوتی ساری پہن رکھی تھی ان کے ایک ہاتھ میں سونے کی دو چوڑیاں اور دوسرے میں گھڑی بندھی تھی۔ سر کے بال، کھچڑی نہیں بلکہ زیادہ تر سفید تھے اور کہیں کہیں کالے تھے، گال کچھ پچک گئے تھے اور چہرے کی رنگت تانبے جیسی تھی۔

"جنو بیٹی جنو!" سبھدرا نے آشیرواد دیتے ہوئے دوشیزہ کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ابھی ڈاکٹر آیا تھا اس نے دیکھ کر بتایا کہ تم گہری نیند سو رہی ہو اور نیند تھوڑی دیر میں ٹوٹ جائے گی۔ پھر بھی ہمیں بڑی فکر تھی۔"

جب دیکھا کہ سبھدرا لڑکی سے باتیں کر رہی ہیں تو تیاگ راج، نریندر، اور پان سنگھ

بھی اندر چلے آئے۔ دوشیزہ نے جس طرح ادب سے سبھدرا کو پرنام کیا تھا اسی طرح ڈاکٹر تیاگ راج کو کیا اور نریندر کو نمستے۔

"بیٹی تمہارا نام کیا ہے" ڈاکٹر صاحب نے اسے آشیرواد دیتے ہوئے پوچھا۔

"نام" دوشیزہ گھبرا گئی اور آنکھیں جھکا کر بولی "مجھے یاد نہیں"

"تعجب ہے کہ اپنا نام بھی یاد نہیں"۔

"نام کیا مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں" دوشیزہ نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دکھ اور مجبوری کا اظہار کیا۔ اور پھر ادھر ادھر نظر گھما کر غمزدہ انداز سے کہا۔

ہے بھگوان مجھے کیا ہوا ہے! نہ کچھ یاد ہے نہ کچھ سمجھ میں آرہا ہے مہربانی کرکے آپ ہی بتائیے کہ میں کہاں ہوں اور یہاں کیسے آگئی۔؟"

چاروں ہی حیرت اور تجسس میں بھرے دوشیزہ کی طرف دیکھنے لگے، کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا، وہ اس کی طرف دیکھتے ہی رہے کیوں کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ ایک ایسی پہیلی بنی ہوئی تھی جسے بوجھ پانا مشکل تھا۔

"شاید وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے" نریندر نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"ایسا ممکن ہے" انہوں نے بھی انگریزی میں جواب دیا اور ذرا توقف کے بعد آگے کہا۔ "ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے واقعات پہلے بھی دیکھنے سننے میں آئے ہیں"۔

دوشیزہ ہتھیلیاں کن پٹیوں پر رکھے انہیں دبا رہی تھی۔

"کیوں بیٹی، کیا سر میں درد ہے؟" سبھدرا نے اس کے نزدیک جا کر ممتا بھرے سر میں پوچھا۔

"ماں جی، درد تو نہیں پر میں حیران ہوں کہ یہ سب کیا ہے مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں آرہا"۔

"گھبراؤ مت یہ تمہارا اپنا گھر ہے ممکن ہے دو چار دن میں تمہاری یادداشت لوٹ آئے، تب تک اطمینان سے یہیں رہو" سبھدرا نے اسے تسلی دی اور پھر ہاتھ تھام کر بولی "چلو پہلے نہا دھو کر کپڑے بدل لو اور پھر کچھ کھا پی لو"

دوشیزہ نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی وہ میلے اور سکڑے ہوئے تھے اور جسم پر کیچڑ لگی تھی۔

"اوہ میں کتنی گندی ہوں" لڑکی نے بھی انگریزی میں کہا اور پھر ترحم انگیز لہجے میں پوچھا۔ کچھ تو بتائیے میری یہ حالت کیسے ہوئی اور میں یہاں کیسے آئی؟"

"آپ مال روڈ پر ایک پیڑ کے نیچے بے ہوش پڑی تھیں" نریندر نے جواب دیا۔

"مال روڈ پر؟"

"ہاں مال روڈ پر۔ پتا جی صبح سیر کو جاتے ہیں ان کی نظر آپ پر پڑ گئی اور ہم یہاں اٹھا لائے"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ لوگ نہ آتے تو میں بچ گئی شاید وہیں پڑے پڑے پران نکل جاتے، چیل کوے نوچ ڈالتے"! دوشیزہ نے ایک جھرجھری لی اور موت کے خوفناک تصور سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پر میں وہاں آئی کیسے؟"

"یہ وہ بات ہے جو ہم خود آپ سے جاننا چاہتے ہیں"

دوشیزہ اور نریندر کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر فوراً جھک گئیں۔

"عجیب پہیلی ہے جسے نہ میں بوجھ سکتی ہوں اور نہ آپ لوگ ہی بوجھ سکتے ہیں" دوشیزہ کی گردن جھکی ہوئی تھی، فقرہ ختم کر کے وہ دانتوں سے انگلی کا ناخن کاٹنے لگی۔

"بیٹی جس پہیلی کو نہ تم بوجھ سکو اور نہ ہم بوجھ سکیں اس کے بارے میں سوچنا پچھتانا، فضول ہے سچ تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی ہی ایک پہیلی ہے جسے وہ اتنا جتن کرنے کے باوجود آج تک سمجھ نہیں پایا" ڈاکٹر تیاگ راج نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر آہستہ آہستہ کہا۔

سبھدرا مسکرائی، نریندر اور دوشیزہ بھی مسکرائے، لیکن پان سنگھ حیرت کی تصویر بنا دیکھتا سنتا رہا، اس سے نہ مسکراتے بنتا تھا اور نہ کچھ کہتے بنتا تھا۔

"اس پہیلی کو پہیلی ہی رہنے دو۔ تم چلو اور نہاؤ دھوؤ"

سبھدرا نے اسے بانہہ سے پکڑا اور اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

---

(۴)

ڈاکٹر تیاگ راج نے کافی دوڑ دھوپ کی تھی اب وہ تکان محسوس کر رہے تھے اس لئے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے تھے نریندر نے فون کا ریسیور اٹھا کر ڈائل گھمایا اور جب نمبر مل گیا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کہئے، میں بھدر سین بول رہا ہوں"

"اور ادھر میں نریندر ہوں"

"اچھا اچھا کیا لڑکی کی نیند ٹوٹی ؟"

"نیند تو ٹوٹ گئی پر ایک دوسرا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جو پہلے سے زیادہ گمبھیر ہے"

"مسئلہ کیا ہے ؟"

"کہہ تو رہا ہوں کہ بہت گمبھیر ہے، مجھے تم سے اس پر بات کرنی ہے یہ بتاؤ کہ تمہیں آنے کی فرصت ہے ؟"

"فرصت تو خیر ہے کیوں کہ اتوار کو کلنک میں چھٹی رہتی ہے میں صرف خاص خاص مریضوں کو دیکھنے آتا ہوں اور اس وقت انہیں کو دیکھ رہا ہوں"

"کتنے باقی ہیں ؟"

"ایک منٹ، رکو، ابھی بتاتا ہوں"

نریندر نے چونگا کان سے ہٹا لیا اور وہ غیر شعوری طور پر انگلیوں کے ناخنوں کو دیکھنے اور ٹٹولنے لگا اس کے ہونٹ بھینچے اور پھر معمول پر آگئے، چونگا دوبارہ کان سے لگایا تو چند سیکنڈ بعد بھدر سین کی آواز سنائی پڑی۔

"صرف تین مریض دیکھنے باقی ہیں انہیں نپٹا کر میں ابھی آرہا ہوں"

"کتنی دیر میں؟"

"دیر........ دیر کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ۔"

نریندر نے اوہنس کا "اسکینڈل" ناول اٹھایا اور اسے پڑھنے کے خیال سے وہ صوفے میں دھنس گیا۔ ناول اسے پسند تھا کیوں کہ اس میں ایک کے بعد ایک دلچسپ، اسکینڈل بیان کئے گئے تھے، وہ اسے آدھے کے قریب پڑھ چکا تھا اور سوچا تھا کہ آج چھٹی کا دن ہے فرصت رہے گی اور وہ اسے ختم کرے گا۔ اس لئے جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے پڑھنا شروع کیا۔ چار پانچ سطریں پڑھ گیا لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ لفظ بے معنی جان پڑتے تھے۔ ان میں کوئی ربط، کوئی سلسلہ نہیں تھا اور پہلے جو پڑھا تھا وہ بھی ذہن سے اتر گیا تھا۔ کتاب بند کر کے وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن نگاہیں خالی خالی تھیں نہ کچھ دکھائی پڑ رہا تھا اور نہ کچھ سوجھ رہا تھا وہ اپنے میں ڈوبتا چلا گیا صبح کا واقعہ اس کے اعصاب پر سوار تھا اور ہری کنٹھی والی دوشیزہ کی صورت اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی یہ صورت جتنی حسین اور پرکشش تھی اتنی ہی بھولی اور معصوم تھی نریندر کے دل میں ایک اندیشہ منڈرا رہا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا ممکن ہے اس معصومیت اور بھولپن میں بھی کوئی اسکینڈل چھپا ہو" لیکن لاجواب حسن میں اسکینڈل سونگھنا بھی تو مناسب نہیں تھا کسی شخص پر بلاوجہ شک کرنا اور اسے مجرم ٹھہرانے کے لئے اس کا اپنا دل تیار نہیں تھا یہ اس کا اندازہ ہی تو ہے اور اندازہ جیسا کہ بھدرسین نے کہا تھا اسے شک وشبہ میں ڈال سکتا ہے شک کی بنا پر کچھ بھی طے کرنا موزوں نہیں تھا لیکن اندیشہ لوٹ لوٹ کر اس کے دل میں آ ہی جاتا تھا اور وہ اس سے دور بھاگنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اسکینڈل پڑھتے پڑھتے اسے ہر طرف اسکینڈل دکھائی دے رہا تھا یہ اس نے پہلی بار محسوس کیا ایک طرف شک وشبہ اور دوسری طرف انصاف اور موزونیت۔ اس کے اندر کشمکش۔ تیز اور تند کشمکش برپا تھی، اور وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ "پہیلی" اسکینڈل سے متعلق خیال کو جھٹکنے کے لئے جو ایک طرح بھوت بن گیا تھا اس نے بلند آواز سے کہا۔

کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی آواز پر چونکا اور فضا میں "پہیلی" لفظ کو گونجتے ہوئے سننے لگا، سنتا رہا اور اپنی ذہنی کیفیت پر غور کرتا رہا۔

"پہیلی ہے تو اسے سمجھنا ہوگا۔"

وہ کتاب صوفے پر پٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور برآمدے میں آکر تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگا، اس کے اندر طوفان برپا تھا اور وہ ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا آخر جب طوفان تھما تو وہ بھی اچانک رکا اور گملے میں کھلے پھولوں کی طرف دیکھنے لگا جن میں کینٹس کے علاوہ سفید للّی بھی تھی۔

گاڑی کا ہارن سنائی پڑا۔ نریندر نے لپک کر پھاٹک کھولا۔ بھدر سین کی کار اندر آئی، اور پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

"اب بتاؤ۔ نیا مسئلہ کیا ہے؟" بھدر سین نے باہیں پھیلا کر سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔

"مسئلہ یہ ہے" نریندر رکا اور وہ جو ناول پٹک گیا تھا اس کے ورق پلٹتے ہوئے بات جاری رکھی "ہوش میں آنے کے بعد وہ کہہ رہی ہے کہ اپنی پچھلی زندگی کی اسے کوئی بات یاد نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ اسے اپنا نام تک یاد نہیں۔"

"سچ؟"

"اور کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

بھدر سین سکتے میں آگیا۔ وہ چپ بیٹھا سوچنے لگا۔ سوچتا رہا اور پھر سامنے دیوار پر لگی ایک تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے یوں بولا جیسے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"یعنی وہ یادداشت کھو بیٹھی ہے۔"

"ہاں کہہ تو یہی رہی ہے۔" نریندر نے جواب دیا اور بات جاری رکھی۔ "اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ سڑک پر کب اور کیسے آئی۔"

"اس کی یہ بات تو یوں صحیح ہو سکتی ہے کہ اسے کوئی بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر پھینک گیا ہو اور جب بے ہوشی ٹوٹی تو وہ تمہارے پاس کوٹھی میں تھی اسے کیا معلوم کہ وہ وہاں کب اور کیسے آئی۔"

بھدر سین اب بھی دیوار پر لگی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال کچھ اور ہے"

"کیا ؟"

نریندر نے 'اسکینڈل' ناول ہوا میں اچھالا اور گیند کی طرح لپک لیا، کچھ لمحے بعد اپنے اندر ضبط اور توازن پیدا کر کے بات شروع کی،

"آج کل کے ان لڑکے لڑکیوں میں مینڈرکس، ایل. ایس. ڈی، مارفیا اور ماریجوانہ جیسی نشیلی چیزوں کا بُرا چلن ہے"

"وہ تو ہے" بھدرسین نے سر ہلا کر ہامی بھری۔ لیکن پھر یہ بھول کر کہ بات کس سلسلے میں ہو رہی اس نے ان کی تاثیر بیان کرنا شروع کر دی۔

"لیکن ان کا جسم پر الگ الگ اثر ہوتا ہے جیسے مارفیا کا انجکشن لینے سے آدمی کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ جسم پر چوٹ کریں، چٹکی کاٹیں تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا اور مینڈرکس کھانے سے نیند خوب آتی ہے ایسی گہری نیند جو دو۔ دو تین تین دن تک نہیں ٹوٹتی"۔

"کیا تعجب ہے کہ اس لڑکی نے بھی مینڈرکس کی گولیاں کھائی ہوں اور وہ انہیں سے بے ہوش ہوئی ہو"

نریندر نے بھدرسین کو درمیان میں ٹوک دیا ورنہ وہ نشیلی چیزوں پر اپنا لیکچر جانے کب تک جاری رکھتا اور اصل مسئلہ دھیان ہی سے اتر جاتا۔

"ہو سکتا ہے وہ مینڈریکس ہی سے بے ہوش ہوئی ہو" بھدرسین نے تائید کی، لیکن اس نے کہا "مگر یادداشت کھو دینے کی وجہ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا مینڈریکس سے کوئی تعلق نہیں"

"میں سمجھتا ہوں کہ یادداشت کھو دینے کا بہانہ بنا کر وہ ہمیں بنا رہی ہے" نریندر نے پہلو بدلتے ہوئے اپنے دل کا وہ شک ظاہر کیا جو اسے بڑی دیر سے پریشان کئے ہوئے تھا۔ بھدرسین غور کرنے لگا۔ وہ ایک پل چپ رہا اور پھر ہونٹوں کا دائرہ سا بنا کر بولا۔

"مقصد ؟"

"کھلواڑ، تفریح۔ مقصد اور کیا ہوگا۔ ان ماڈرن لڑکے اور لڑکیوں کے لئے پوری زندگی ہی ایک کھلواڑ اور تفریح ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں"۔

نریندر نے اپنی بات اس انداز سے کہی کہ بھدرسین کھل کھلا کر ہنس پڑا اور نریندر بھی مسکرایا۔

"ٹن ٹن ......"

فون کی گھنٹی ہوئی۔ نریندر نے لپک کر چونگا اٹھایا معلوم ہوا کہ ناگپور سے اتفاقاً دیہات کا کوئی پروفیسر دلی آیا ہوا ہے اور وہ ڈاکٹر تیاگ راج سے ملاقات کرنا چاہتا ہے نریندر نے اسے بتا دیا کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب آرام فرما رہے ہیں وہ کوئی آدھ گھنٹے بعد دوبارہ فون کرے۔

"دیکھو نریندر، میرا ایک اصول ہے،" وہ جب لوٹ آیا تو بھدر سین نے بات شروع کی "اور اصول یہ ہے کہ سو کے سو آدمیوں پر شک کرنے کی بجائے دس سے دھوکا کھا لینا بہتر ہے"

"دھوکا تو خیر وہ کیا دے گی۔ میں نے تو یونہی اپنا ......"

"اندازہ" لفظ نریندر کے حلق میں اٹک گیا کیوں کہ بھدر سین نے پہلے ہی کہا تھا کہ اندازے سے آدمی شک میں پڑ سکتا ہے۔

"دوسری بات"، بھدر سین پھر بولا "میں جب شہد دیکھتا ہوں تو حسن کا تصور کرتا ہوں اور جب حسن دیکھتا ہوں تو شہد کا۔ شہد کی یہ صفت ہے کہ وہ کبھی سڑتا نہیں بلکہ دوسری چیزوں کو سڑنے سے روکتا ہے آیورویدِ والے شہد کے اس گن کو جانتے تھے اور اس کا استعمال کرتے تھے۔ اب ایلو پیتھی والے شہد کی جگہ الکوحل استعمال کرتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب، شہد اور الکوحل میں جو فرق ہے ذرا اس پر بھی توجہ فرمائیے۔"

اس بار نریندر کھل کھلا کر ہنسا اور بھدر سین مسکرایا۔ مطلب یہ تھا کہ آج شہد شہد نہ رہ کر الکوحل بن گیا ہے۔

ڈاکٹر تیاگ راج آرام کر چکے تھے، ایک دروازے سے وہ اور دوسرے دروازے سے سبھدرا اندر آئیں سبھدرا کے ساتھ دوشیزہ بھی تھی اس نے اب سفید ساری اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور گلے کی ہری کنٹھی اتار دی تھی سفید پوشاک میں اس کا روپ ہی بدل گیا تھا وہ اب شوخ ماڈرن لڑکی نہیں سوشیل اور شرمیلی ہندوستانی لڑکی تھی۔

"آپ ڈاکٹر بھدر سین ہیں۔ صبح تم جب بے ہوش پڑی تھیں تو انہی کو بلایا گیا تھا آپ ہمارے رشتے دار بھی ہیں۔"

نریندر نے تعارف کرایا اور دوشیزہ نے سلیقے سے پرنام کیا،

"نیلی کی ساری کی جگہ میں تو یہ مجھے یہ بھی دوسری نیلی جان پڑتی ہے،" سبھدرا نے

مشفقانہ انداز سے دوشیزہ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مدھر مسکان اُتر آئی۔

نلنی سبھدرا کے بڑے لڑکے جیتندر کی بیوی اور بھدر سین کی چھوٹی بہن تھی۔

"ڈاکٹر، یہ بتاؤ کہ زندگی کی پچھلی باتیں بھول جانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" نیاگ راج نے بھدر سین سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ بے ہوشی ویسے تو ٹوٹ گئی ہے لیکن دماغ پر اس کا اثر اب بھی باقی ہے۔" بھدر سین نے ایک نظر دوشیزہ کی طرف دیکھا اور ذرا رک رک آگے کہا۔ "جب وہ اثر پورے طور سے جاتا رہے گا تو یادداشت خود بخود لوٹ آئے گی۔"

"کب تک؟"

"یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" بھدر سین نے جواب دیا۔ اور نیاگ راج سے نظر ہٹا کر دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرف دیکھا، اسی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "ایک دن، ایک ہفتہ، ایک سال یا اس سے بھی زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔"

لڑکی نے بھدر سین کی بات سنی تو اپنا سر سبھدرا کے کندھے پر رکھ دیا جیسے جنگل کی بے سہارا بیل نے پیڑ کا سہارا لے لیا ہو۔ باپ اور بیٹا دونوں کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لیکن باپ کی نظر میں ہمدردی اور بیٹے کی نظر میں مشکوک بے رحم سوال تھا۔ "تب تک کیا کیا جائے؟ پولیس کو اطلاع کر دیں؟" نیاگ راج نے لڑکی پر سے نظر ہٹا کر بھدر سین کی طرف دیکھا۔

"اطلاع کر دینے میں کوئی ہرج نہیں۔" بھدر سین نے جواب دیا اور کہا "شاید وہی کوئی کھوج خبر لگا لیں۔"

"تب تک اسے ناری نکیتن میں رکھا جائے۔"

"ناری نکیتن" کے نام پر دوشیزہ یوں چونکی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے آنکھیں پوری کھول کر سبھدرا کی طرف دیکھا ان میں بہتر رحم التجا تھی۔

"واہ صبح تو کہہ رہے تھے تمہیں پلی پلائی بیٹی مل گئی اور اب اسے ناری نکیتن بھیجنے کو تیار ہو۔ نہ بابا میں اپنی بیٹی کو اس نرک میں کبھی نہ جانے دوں گی۔"

سبھدرا نے لڑکی کو چھاتی سے لگا لیا اور پیار سے اس کا سر سہلانے لگی۔ لڑکی بھی سبھدرا سے لپٹ کر شفقت اور ممتا کا مزہ لے رہی تھی یوں لگا کہ مدت سے بچھڑی ماں بیٹی اچانک آ ملی ہیں۔

(۵)

سبھدرا دس بارہ برس تک گرلز کالج میں پرنسپل رہ چکی تھیں اس دوران نجانے کتنی، طالبات اور کتنی استانیوں سے ان کا واسطہ پڑا تھا کئی ایک سے قریبی تعلق قائم ہو گیا تھا جن پر انہوں نے اپنے دل کا پیار انڈیلا تھا ویسے ان کا سلوک سبھی کے ساتھ پیار اور شفقت کا تھا جہاں بھی رہیں انہوں نے تعریف اور احترام حاصل کیا۔ اب وہ ومینز ایسوسی ایشن میں سرگرم حصہ لے رہی تھیں۔ اونچے گھرانے کی سماج سدھار اور سیاست میں سرگرم سرکردہ خواتین سے میل جول تھا۔ اس کے علاوہ وہ شوہر کے ساتھ پبلک جلسوں، میٹنگوں اور پارٹیوں میں آتی جاتی تھیں۔ پڑھانے کے کام سے فراغت پا لینے کے بعد بھی زندگی میں مصروفیت، گہما گہمی اور چہل پہل بدستور قائم تھی۔ پھر بھی انہیں زیادہ تر وقت گھر ہی میں گذارنا ہوتا تھا، گھر میں بہو نہیں تھی، بچے نہیں تھے، ایک نریندر تھا وہ بھی صبح دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا تھا۔ اکثر وہ اور پان سنگھ دو ہی افراد گھر پر رہ جاتے تھے تب انہیں مکان سونا سونا لگتا تھا اپنے اندر ایک خلا ایک کمی محسوس ہوتی تھی جن لڑکیوں اور جن استانیوں سے ان کا گہرا تعلق رہا تھا اور جن پر انہوں نے اپنے دل کا پیار انڈیلا تھا ان کے چہرے آکاش پر منڈرانے والے اساڑھ ساون کے بادلوں کی طرح قریب آتے اور پھر بغیر برسے ہی دور چلے جاتے تھے۔ ان کے اندر کا خلا پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ جاتا تھا اور سناٹا گہرا ہوتا جاتا تھا۔

"پان سنگھ!" وہ آواز لگاتیں۔

"جی: بی بی جی" پان سنگھ ہاتھ کا کام چھوڑ کر کچن سے دوڑا دوڑا آتا۔

"کیا کر رہے ہو!"

"ہاں بین رہا ہوں۔"

"اچھا جاؤ بیٹو"

پان سنگھ مالکن کا منہ تاکتا ہوا لوٹ جاتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اسے بلانے کا مطلب کیا تھا۔

بھو آئی تو وہ سات سمندر پار پردیس چلی گئی۔ نریندر سے کتنی بار کہا کہ بیٹا اب بیاہ کرلو سونا گھر کھانے کو آتا ہے۔ سبھدرا نے دو تین لڑکیاں بھی پسند کرلی تھیں، مگر نریندر پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لڑکی دیکھنے تک سے انکار کر دیا جیسے اس نے بھیشم پتامہ کی طرح زندگی بھر کنوارا رہنے کا عہد کر رکھا ہو، بھیشم پتامہ نے اپنی جوانی بوڑھے باپ کی ہوس پرستی پر قربان کردی تھی لیکن نریندر کے اس عہد کی کوئی وجہ نہیں تھی بلکہ اس نے ماں کی مناسب تمنا کو جھٹلایا تھا

اب اس حسینہ کے اچانک آجانے سے سبھدرا کو راحت ملی اور اس کے اندر کا خلا بھر گیا کسی کو بیٹی کہہ کر پکارنے اور اس کے ساتھ بولنے تتلانے کی حسرت پوری ہوئی اس لئے پولیس کو اطلاع دینے کے بعد جب یہ طے پایا کہ کھوج خبر ملنے تک لڑکی ڈاکٹر تیاگ راج ہی کے مکان پر رہے گی اور اسے ناری نکیتن یا اس قسم کی کسی دوسری جگہ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں تو لڑکی ہی کو نہیں خود سبھدرا کو بڑی خوشی ہوئی تھی خوشی کے موقعوں پر جیسے اکثر ہوتا تھا سبھدرا نے اس مرتبہ بھی پان سنگھ کو فوراً بلایا اور دو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا "تم جاؤ گھوم پھر آؤ چھٹی کرو۔ شام کا بھوجن ہم ماں بیٹی خود بنالیں گی۔

پان سنگھ کے چلے جانے کے بعد دوشیزہ کو اپنے کھانا بنانے کے ہنر کی نمائش کا سنہری موقع ہاتھ لگا۔ رات کا کھانا اتنا عمدہ، اتنا ذائقے دار بنا کہ باپ بیٹے دونوں نے سیر ہو کر کھایا اور دوشیزہ نے جو دو سپیشل پلیٹیں پہلی بار تیار کی تھیں انھیں جی بھر کر سراہا۔

اگلے دن جب اخبار آیا پہلے ہی صفحے پر ایک خبر کی سرخیاں دیکھ کر نریندر چونک اٹھا۔

'ایک دوشیزہ کی پراسرار موت

قدوائی نگر میں لاش ملی'۔

اغل بغل میں دیس بدیس کی اہم خبریں چھپی تھیں، جانے کیوں سب سے پہلے یہی خبر نریندر کی توجہ کا مرکز بنی۔ سرخیاں دیکھ کر وہ ایک لمحہ رکا اور پھر لمبی سانس چھوڑ کر نیچے درج پوری خبر پڑھی

"نئی دلی - ۷ ستمبر - مینا نام کی تئیس چوبیس برس کی ایک جوان لڑکی جو ایک انڈ کے کمپنی میں اسسٹنٹ تھی اور ورکنگ گرلز ہوسٹل میں رہتی تھی آج صبح قدوائی نگر میں مردہ پائی گئی۔ اس کا چہرہ بری طرح مسخ تھا۔ وہ صرف کپڑوں سے پہچانی گئی۔ لگتا ہے کہ قتل کہیں اور ہوا لیکن قاتل اس کی لاش یہاں گندے نالے کے قریب پھینک گئے۔ پولیس اس واردات کی تفتیش کر رہی ہے۔"

اگر نریندر نے خود ایک پراسرار واقعہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا اور اتنی ہی عمر کی ایک نوجوان لڑکی بے ہوشی کی حالت میں گھر نہ آئی ہوتی تو شاید وہ اس خبر کو بغیر پڑھے ہی چھوڑ دیتا اور اگر پڑھتا بھی تو بالکل سرسری نظر سے، وہ اس کے دل کو ہرگز نہ چھو پاتی، قتل اور اغوا کی ایسی ہی سنسنی خیز خبریں ہر روز چھپتی رہتی ہیں۔ وہ محض اخبار کی بکری بڑھانے کا ذریعہ ہیں ورنہ ان کی کون پرواہ کرتا ہے؟ نریندر انہیں عموماً نظر انداز کر دیتا تھا۔ لیکن آج اس خبر کا اس نے ایک ایک لفظ بڑے دھیان سے پڑھا۔ پڑھ کر اس کا خون کھولا اور اس کے اندر چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں، خبر اس نے باپ کو سنائی، ماں کو سنائی اور بے نام کی اس شرنارتھی لڑکی کو سنائی۔

"ایسی وارداتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔" خبر سنانے کے بعد نریندر نے اس کا ردعمل ظاہر کیا۔

"ان وارداتوں کا بھرشٹاچار سے سیدھا تعلق ہے۔ جیسے جیسے بھرشٹاچار بڑھے گا ایسی وارداتیں بھی بڑھیں گی۔" ڈاکٹر تیاگ راج نے بیٹے کی بات کو نظریاتی ڈھنگ سے پیش کیا۔

لیکن دوشیزہ کی اس بات چیت میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی خبر سنتے ہی اس کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا اور ہونٹ بھنچ گئے جیسے دوبارہ بے ہوش ہو جائے گی۔ جوں ہی ڈاکٹر صاحب نے بات ختم کی وہ چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیوں بیٹی، طبیعت کیسی ہے؟" سبھدرا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" دوشیزہ نے مختصر جواب دیا اور وہ ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

"بے چاری کے من پر جانے کیا بیت رہی ہے اچھا تھا کہ یہ خبر اسے نہ سنائی ہوتی۔" سبھدرا نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیں نہ سناتا تو وہ خود پڑھتی تب بھی اس کی یہی کیفیت ہوتی"

نریندر نے ماں کو جواب دیا لیکن اس نے خود محسوس کیا کہ دوشیزہ کے دل کو واقعی گہری ٹھیس پہنچی ہے ورنہ وہ ہرگز یوں اٹھ کر نہ چلی جاتی۔

کوٹھی میں کل ملا کر سات کمرے تھے، جب دوشیزہ کا یہاں ٹھہرنا طے پایا تبھی اسے ایک الگ کمرہ دے دیا گیا تاکہ وہ اپنے کو ہر طرح آزاد محسوس کرے مرضی کے مطابق اٹھے بیٹھے، اور جب چاہے آرام کرے۔

ڈرائنگ روم سے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آئی اور آتے ہی دھم سے پلنگ پر گر پڑی اس نے تکیہ اٹھا کر چھاتی کے نیچے رکھا اور اس پر اوندھے منہ لیٹ گئی، خبر نے دوشیزہ کے اندر جو اتھل پتھل مچا دی تھی کسی دوسرے کے لئے اسے سمجھ لینا ممکن نہیں تھا۔ بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور باہیں پھیلا دیں، سمجھدرا آئی اور دروازے پر ایک نظر دیکھ کر لوٹ گئی، نریندر نہا دھو کر دفتر چلا گیا گھر میں سکون تھا۔

دوشیزہ اسی طرح لیٹی رہی، وہ رہ رہ کر کبھی مٹھیاں بھینچتی اور کبھی پاؤں پٹکتی تھی، کافی دیر یونہی لیٹے رہنے کے بعد اس نے دھڑ اوپر اٹھایا اور کہنیاں پلنگ پر ٹیک کر سر ہاتھوں میں تھام لیا، اس کی نگاہیں سامنے دیوار پر ٹکی تھیں اس نے سر کو جھٹکا دیا اور منہ سے الفاظ پہاڑی جھرنے کی طرح پھوٹ نکلے۔

"مرنے والی خواہ کوئی بھی ہو اسے میرا نام اوڑھا دیا گیا ہے، یہ نام کفن کے ساتھ جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک ہو جائے گا۔ دنیا بھول جائے گی کہ مینا نام کی ری سیپشنسٹ لڑکی کا بھی کبھی کوئی وجود تھا۔ یہ میرے ایک جنم کا انت اور دوسرے کی شروعات ہے مرنے والی نے مجھے تمام بندھنوں سے آزاد کر دیا ہے نہ مجھے کوئی یاد کرے گا اور نہ مجھے کھوجنے کی سردردی مول لے گا۔ میں زندہ ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے لئے مر چکی ہوں۔ موت جو انسان کے لئے اس قدر بھیانک ہے میرے لئے بردان بن گئی، ہے۔ اب میں آکاش میں اڑنے والے پنچھی کی طرح آزاد اور خود مختار ہوں۔ شاید یہ مرحوم لڑکی بھی "سپورن ناری" بننے کی کوشش کر رہی تھی وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہی لیکن میری لیلا بھوا کہ گئی، یہ میری نئی زندگی ہے اور اس نئی زندگی میں میرا

نیا نام ـــ محض ایک نیا نام ہے۔ سمپورن ناری! سمپورن ناری!"

اپنا یہ نام دہراتے ہوئے دوشیزہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تکیئے کو اٹھا کر ہولے میں اچھالا اور اچک لیا۔ من اب ہلکا تھا اور وہ چڑیا بن کر اڑ جانا چاہتی تھی۔

"بیٹی، ناشتہ لے لو" سبھدرا کی آواز سنائی پڑی۔

"آئی ماں جی" دوشیزہ نے جواب دیا۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری پرت تھی۔ اور وہ ضبط اور سکون کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

---

(۶)

نر بیندر کی عمر بتیس تینتیس برس تھی قد پانچ فٹ پانچ انچ، رنگ گندمی، داہنی آنکھ کے نیچے ننھا سا تل، بال گھنے اور گھنگھریالے تھے، وہ گذشتہ چھ سات برس سے "سو ستکا لمیٹڈ" نام کی کمپنی میں اٹھارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پا رہا تھا۔

سو ستکا لمیٹڈ کمپنی مغربی جرمنی کے ساتھ معاہدے میں چل رہی تھی، یہ کمپنی ٹریکٹر اور اسکوٹر بناتی تھی، اس نے اپنے ٹریکٹر کا نام "کسان" اور اسکوٹر کا نام "چیتک" رکھا تھا۔ ٹریکٹر اور اسکوٹر کے کچھ پرزے کمپنی خود بناتی تھی، کچھ فرید آباد کی "جے ہند کمپنی" سے خریدے جاتے تھے اور کچھ مغربی جرمنی سے درآمد ہوتے تھے۔ پھر بھی کمپنی نے اپنی تیار شدہ اشیاء کا "شدھ سودیشی" نام اس لئے رکھا تھا کہ پانچویں دہا گے اسے بھارتیہ سنسکرتی کے افتخار کی چرچا خاص طور پر بڑھ گئی تھی، کلچر سے سیاست اور تجارت میں آج نہیں، ہمیشہ ہی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ برطانوی عہد حکومت میں جب جرمنی کا ٹبوارہ نہیں ہوا تھا اور بیوپار کے شعبے میں برطانیہ سے اس کا مقابلہ تھا اس نے اپنے ماہرین ہندوستان بھیجے تھے مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستانی رسم و رواج، کلچر اور زبان کا مطالعہ کریں تاکہ ہندوستان کی منڈی میں برطانوی مال کو مات دی جا سکے۔ اس میں انھیں کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ "صفاچٹ" بلیڈ جس کا غیر منقسم ہندوستان میں کافی چلن تھا جرمنی سے بن کر آتا تھا۔

جب سے برطانیہ کی اجارے داری ختم ہوئی تھی تب سے سبھی سامراجیہ وادی دیشوں کو بھارت کی منڈی میں اپنے گھوڑے دوڑانے کی کھلی چھوٹ مل گئی تھی نتیجہ یہ کہ مخلوط اقتصادیات کے ہمارے اس غیر ترقی یافتہ ملک میں چھوٹے اور بڑے پیمانے کے صنعتی معاہدوں کی باڑھ سی آگئی تھی غیر ملکی سرمایہ اور غیر ملکی نو ہاؤ (تکنیکی جانکاری) کی بنا پر

نئے نئے کارخانے اور نئی نئی کمپنیاں کھلتی چلی گئیں ۔ غیر ملکی ماہرین اور صلاح کار آئے ۔ منیجر اور انجنیئر آئے اور اس روپ میں ہاتھ پر سرسوں اگانے والے لومڑی مزاج کے بھیڑیئے اور جاسوس بھی آئے ، ہمارا غریب ملک بین الاقوامی سازشوں کا اکھاڑہ بنتا چلا گیا ۔

ان غیر ملکیوں کی تنخواہیں اور بھتے ان کے اپنے معیار زندگی کے مطابق اسی عہدے کے ہندوستانیوں کی تنخواہ اور بھتے سے کئی گنا زیادہ تھے ، تنخواہ اور بھتے ہی کی نسبت سے ان کی عیاشی کا معیار بھی بہت اونچا تھا ۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے ان غیر ملکیوں کے ساتھ کام کرنے والے ہندوستانیوں نے یہاں ان سے " نو ہاؤ " سیکھا وہاں ان میں یہ احساس بھی بڑی تیزی سے بڑھا کہ جینے کا " اصل فن " تو صرف یہی لوگ جانتے ہیں ، ہم تو یوں ہی پھوہڑ گنوار اور دقیانوسی بنے بھاڑ جھونک رہے ہیں اور ان کے مقابلے میں صدیوں پچھڑ گئے ہیں ، نتیجہ یہ کہ زندگی کو زندگی بنانے والی مسرتوں اور آسائش سے محروم ہو گئے ہیں جس رفتار سے ملک کی صنعتی ترقی ہو رہی تھی صدیوں کا فاصلہ جلد سے جلد طے کر کے جدید بننے کی رفتار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی ، بوتل اور عورت کا رواج بڑھا ۔ من بہلانے کی خفیہ تفریح گاہیں اور عیاشی کے اڈے قائم ہونے لگے ، عیاشی کے یہ اڈے قائم کرنے اور انہیں چلانے میں قانون اور امن کے لئے ذمے دار اعلیٰ افسروں کا ہاتھ رہتا تھا ۔ خود کوتوال کے چور بن جانے سے جس حالت کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے آخر وہی حالت پیدا ہو گئی صنعت اور تجارت کا فروغ کم ، ناجائز دھندوں اور کالے دھن کا پھیلاؤ زیادہ ہوا ۔

بوتل اور عورت کی محتاج اس عیاش تہذیب نے جس اشتعال انگیز لٹریچر اور فلموں کو جنم دیا ان کی درآمد بھی ہمارے درماندہ ملک میں بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی تحریک آزادی کے دنوں میں جس ادبی ذوق کی نشوونما ہوئی تھی اور ہم نے جو آدرش پالے تھے گذشتہ پچیس تیس برس میں اس ذوق کا انحطاط اور آدرشوں کی ہتیا ہوئی تھی ۔ اس ذوق اور ان آدرشوں میں پلے پرانی پیڑھی کے لوگ دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے نئی پیڑھی کے پڑھے لکھے لوگوں میں اکثریت ان کی تھی جو اس انحطاط پسند عیاشی میں ڈوبے ہوئے تھے ، بدہضمی کے مریض کو جیسے چورن کی چاٹ لگ جاتی ہے اس نئی پیڑھی کو اشتعال انگیز فحش لٹریچر اور سنسنی خیز عریاں فلموں کی چاٹ لگ گئی تھی ۔ نراجیت اور ،

قانون شکنی بڑھ رہی تھی۔ نفس پرستی اور خودغرضی ہی زندگی کا مقصد بنتی جا رہی تھی ملک اور قوم کی بات سوچنے اور کہنے والوں کو اگلے وقتوں کا آدمی کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔

انجنیئری پاس کرنے تک نریندر کے ہم سبق اور اس کے پروفیسر اس کی ذہانت اور ہنرمندانی کا لوہا مانتے تھے۔ باپ کے پاس کافی بڑی ذاتی لائبریری تھی، نئی نئی کتابیں اور رسالے خریدنا جو یہاں نہ ملیں انہیں غیر ملکوں سے منگوانا ان کی واحد ہابی تھی۔ نریندر کو سنجیدہ موضوع کی کتابیں پڑھنے، سیاسی، اقتصادی اور سائنسی ادق مسائل کے سمجھنے سلجھانے کا شوق پڑ گیا تھا۔ نامور مفکر، تحریک آزادی کے مجاہد اور دانشور تیاگ راج سے ملنے آیا کرتے تھے، اور گھر پر کئی طرح کی خیال انگیز بات چیت اور بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے، اس ماحول میں نریندر کی جانکاری جانے انجانے بڑھتی رہی اور ذوق کی تربیت ہوتی رہی بھدرسین کو وہ بچپن ہی سے جانتا تھا لیکن کالج میں پہنچ جانے کے بعد وہ اس کی طرف خاص طور سے راغب ہوا تھا وجہ یہ کہ بھدرسین پیشے سے خواہ ڈاکٹر تھا۔ لیکن وہ ادب اور فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے والا خوش مذاق نوجوان تھا۔ نریندر جن سوالوں اور مسئلوں کو پتا کے سامنے رکھنے میں ہچکتا تھا بھدرسین کے ساتھ ان پر کھل کر بات چیت ہوتی تھی اور بال کی کھال اتاری جاتی تھی۔

بھدرسین کا خاندان تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے علاوہ پچھلی دو پشتوں سے سیاست میں عملی حصہ لیتا آرہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اندرسین انقلابی جماعت 'نوجوان بھارت سبھا' کا ممبر تھا۔ اسے ایک بینک ڈکیتی کے سلسلے میں چھ سال سخت قید کی سزا ہوئی تھی، اور اب بھی وہ ایک مشہور ٹریڈ یونین لیڈر تھا۔ بھدرسین نے خواہ سیاست میں عملی حصہ نہیں لیا تھا مگر اس کا نظریہ ادب، اور سیاست ہی میں نہیں اپنے پیشے میں بھی عوامی تھا وہ دیس کے عوام اور ان کے رسم و رواج میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔

نریندر بھدرسین کے ان اوصاف سے متاثر تھا اور اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اس نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان دونوں میں جو رشتہ قائم ہوا تھا اسے دوستی، استادی، شاگردی یا کوئی دوسرا نام دیا جا سکتا تھا ورنہ نریندر سے اگر پوچھا جاتا کہ تمہاری ذہنی تربیت

میں باپ کے علاوہ اور کس کا زیادہ حصہ ہے تو اس کا جواب ہوتا۔" ڈاکٹر بھدر سین کا"

نریندر کے لئے بھدر سین کے دل میں جو پیار اور محبت کا جو پُر خلوص جذبہ تھا اسے نریندر ہی نہیں ڈاکٹر تیاگ راج اور سبھدرا نے بھی بخوبی سمجھ لیا تھا۔ دلی جذبات چھپائے نہیں چھپتے انسان کی تو بات ہی کیا انہیں چوپائے اور پرندے تک سمجھ لیتے ہیں۔

بھدر سین کا چھوٹا سالا کھونیش نریندر کا ہم جماعت تھا ایک پارٹی کے سلسلے میں بھدر سین جب اس کے گھر پہنچا تو وہاں چار پانچ آدمی پہلے سے موجود دیکھے اور ان سے بنگلہ دیش کی لڑائی پر گفتگو ہو رہی تھی نریندر بھی پہنچ چکا تھا لیکن وہ سب سے الگ "فلم فیئر" پڑھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے بھدر سین کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے اور زیر بحث مسئلہ پر اپنی رائے دینے کا پتہ تک نہیں چلا۔

"نریندر!"

آواز پہچان کر نریندر چونکا اور اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔

بھدر سین جو صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب ایک کرسی پر جا بیٹھا تھا آہستہ سے بولا۔

"اس فلمی رسالے میں تمہاری اتنی دلچسپی، تعجب ہے"

نریندر جھینپ گیا اور رسالہ بند کر کے جواب دیا۔ "کیا کیا جائے جن لوگوں میں ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہے ان کی بات چیت کا واحد موضوع فلم ہے۔ آپ جان سکتے ہیں ساتھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔"

"یوں کہو۔ نمک کی کان میں جو بھی جاتا ہے اس کا نمک بن جانا لازمی ہے"

نریندر نے بازو اٹھا کر انگڑائی لی اور جواب میں صرف مسکرا دیا۔ بھدر سین اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہ گیا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈھائی تین سال پہلے کا نریندر اس تھوڑے سے عرصے میں اتنا بدل گیا ہے۔ نمک کی کان کا محاورہ اس نے جس شدید تلخی سے استعمال کیا تھا وہ اسے چھو تک نہیں پائی تھی۔

لیکن نریندر نمک بنا نہیں تھا بننے کے عمل میں تھا اس نے فلم فیئر ہی نہیں جیمس ہیڈلی چیز اور رومینس کے جاسوسی ناول بھی پڑھنا شروع کر دیئے تھے اور اسے وہ پسند تھے چور ی

چھپے بکنے والا عریاں لٹریچر بھی نظر سے گذرا تھا جو اس نے ناک بھوں چڑھا کر الگ ہٹا دیا تھا۔ اپنے ایک رفیق سریش کے مکان پر بلیو فلموں میں جنسی غلاظت کے ہولناک سین اور عورت کو نہایت پراگندہ اور مکروہ شکل میں دیکھا تو دل حقارت سے بھر گیا۔ تربیت یافتہ احساس کو ٹھیس پہنچی اور مانس کے اس دریا میں ڈوبنے کے بجائے جنسی وحشت اور بربریت سے اسے گہری نفرت ہو گئی۔ جو آخر بیاہ نہ کرنے کے عہد میں بدل گئی۔ ڈاکٹر تیاگ راج نے اس سلسلے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن ماں، دوسرے سمبندھی اور بھدر سین کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اور اس نے بیاہ کی ہر تجویز کو ٹھکرا دیا۔

(۷)

حقارت، کشش، کشمکش، حقارت، جب سے دوشیزہ گھر میں آئی تھی نریندر متضاد جذبات کی مسلسل کشمکش میں جی رہا تھا۔ اس کے پہلے دن کی پوشاک، سکرٹ ٹاپ اور کنٹھی سے اس شبہ کی تائید ہوتی تھی کہ اس نے مینڈرکس کی گولیاں کھائی ہیں ورنہ نیند سے بے ہوش ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی رکشا یا اسکوٹر میں وہ کہیں جا رہی ہوگی کہ اس میں بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی، اب رکشا والا یا اسکوٹر والا اسے پہنچائے تو کہاں پہنچائے ٹھور ٹھکانہ کچھ معلوم نہیں، جھنجھٹ سے بچنے کے لئے وہ اس بلا کو سڑک پر پھینک کر چلتا بنا ہوگا۔ مرے یا جئے، اسے اس سے مطلب؟ دسمبر جنوری کی ٹھنڈی رات ہوتی تو شاید وہ ٹھٹھر کر مر گئی ہوتی۔ اگر بے ہوشی کی حالت میں وہاں کچھ دیر پڑی رہتی تو ممکن تھا کہ چیل کوّے، کتے اسے نوچ ڈالتے اور اس کی ویسی ہی مسخ شدہ لاش پولیس کو ملتی جیسے قدوائی نگر میں اتنی ہی عمر کی کسی دوسری دوشیزہ کی ملی تھی موسم اچھا تھا اور پتا جی کچھ جلد ہی گھر سے نکلے اور انہوں نے اسے دیکھ لیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے یادداشت کھو دینے کا ناٹک رچایا ہو؟"

نریندر سوچتے سوچتے ایک خاص نقطے پر پہنچا تو اس کی فکر سوال بن کر ہونٹوں پر آگئی۔

لیکن ماں باپ، ان کی بات ہی الگ تھی وہ سیدھے سبھاؤ کے لوگ تھے انہیں جو زندگی وراثت میں ملی تھی اسے قدم قدم آگے بڑھانے کا فخر حاصل تھا نئی پیڑھی کی گمراہ کن جدیدیت کو نہ انہوں نے دیکھا پرکھا تھا اور نہ ان کے دل میں اس کے لئے کسی طرح کا تعصب تھا۔ کسی بھلے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی کو مصیبت میں دیکھ کر ان کی روایتی ہمدردی امڈ آئی تھی،

اب جب اسے ساتھ رہتے دو مہینے گذر چکے تھے سبھدرا اور نریندر کے رویے سے یہی لگتا تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی کے روپ میں اپنا لیا ہے وہ ان کے لئے اجنبی یا پرائی نہیں رہ گئی ہے۔

اور پھر ڈاکٹر بھدر سین، اس کا دل بھی تعصبات سے مبرا صاف سلیٹ تھا جس پر وہ کوئی بھی غلط لفظ یا ناگوار لفظ لکھنا نہیں چاہتے تھے، ڈاکٹر کے پاس چور آئے یا سادھو آئے وہ دونوں کو ایک ہی جذبے سے دیکھے گا۔ بیمار ہیں تو وہ دونوں کا علاج کرے گا۔ وہ کسی کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ پھر ڈاکٹر ہونے کے علاوہ اسے ادب اور آرٹ سے بھی پریم تھا اور اس کے ترقی پسند نظریے کے مطابق دیس پریم کا مطلب دیس کی جنتا سے پریم کرنا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے اس نظریے کو زندگی میں ڈھال رکھا تھا۔ اسی لئے بھدر سین نے دوشیزہ کو انتہا پسند جدیدیت کی پوشاک میں دیکھنے کے بجائے اس کے حسن کو دیکھا اور سہج میں اسے شہد سے تشبیہہ دی تھی۔ شہد جو کبھی سڑتا نہیں اور دوسری چیزوں کی بھی سڑنے سے رکشا کرتا ہے۔ اس لئے بغیر جانے بوجھے دوشیزہ کے ساتھ کسی ناگوار خیال کو جوڑنا، اس میں کسی عیب کا تصور کرنا بھدر سین کے لئے ممکن نہیں تھا۔

بلاشبہ دوشیزہ کے لاثانی حسن سے نریندر بھی متاثر تھا۔ بھدر سین کے ساتھ وہ بھی اسے خستہ حالت میں نہارتا رہا تھا پھر جب وہ اسکرٹ اور ٹاپ کی جگہ لمبی سی ساری اور جمپر پہن کر سامنے آئی تو اس کا مدھر روپ اور بھی نکھر آیا تھا تب اس میں گھن پیدا کرنے والے موم کی ذرا بھی ملاوٹ نہیں تھی۔ رواں دواں آگ کی لو خالص مدھو تھی۔

اس لو کی تیز آنچ نے تعصب کو پگھلا دیا تھا اور نریندر کے دل سے حقارت اور بے اعتنائی کی موٹی موٹی پرتیں ایک ساتھ اتر گئی تھیں۔

سبھدرا اور دوشیزہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔ پان سنگھ سبزی خریدنے بازار گیا ہے دوشیزہ کی نگاہیں دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکے دروازوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ آتی ہے اس کے ہونٹ کپکپاتے ہیں اور وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے خیال بار بار دل میں اٹھتا ہے اور ہونٹ بار بار کپکپا اٹھتے ہیں آخر اس کے لئے اپنے پر ضبط کرنا، ہونٹوں

پر آنی بات کو پی لینا ممکن نہیں رہتا اور وہ سبھدرا سے پوچھتی ہے۔

"ماں جی، یہ پردے کب خریدے گئے تھے؟"

دوشیزہ جب میٹھے اور مؤدب لہجے میں ماں جی، کہہ کر پکارتی تھی تو سبھدرا کو اس میں بیٹی اور بہو دونوں کا روپ بیک وقت دکھائی پڑتا ہے اور ان کی آتما کا کن کن کھل اٹھتا ہے۔

"پردے!" سبھدرا نے دوہرایا اور ذہن پر زور ڈال کر کہا۔

"جتیندر کے بیاہ کو آٹھ دس برس ہوئے تبھی خریدے گئے تھے۔"

"اب نئے ڈیزائن کے نئے پردے خریدے جائیں تو کیسا رہے؟"

سبھدرا نے ایک نظر لڑکی کو دیکھا اور پھر ایک نظر ڈرائنگ روم پر ڈالی، پردے واقعی گھس پٹ گئے تھے رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور ان پر اردھ ناری چتروں اور ہاتھی سونڈ کو الگ الگ پہچان سکنا مشکل تھا۔

"ہاں، یہ پردے تو اب بدلے ہی جانے چاہئیں۔" سبھدرا نے لڑکی کی تجویز کی تائید کی۔

پردے بدل دینے کا سجھاؤ تیاگ راج اور نریندر کو بھی پسند آیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں کہیں کچھ ٹھہراؤ، اداسی یا بدذوقی ضرور آگئی ہے ورنہ پردے اس قدر پرانے اور بوسیدہ ہو گئے تھے کہ انہیں اب تک ضرور بدل جانا چاہئے تھا۔ اس بات کو باپ سے زیادہ بیٹے نے محسوس کیا اور وہ دوشیزہ کی نفاست پسندی کا قائل ہو گیا۔

دوسرے ہی دن نئے پردے آگئے ان کی گہرے پیلے رنگ کی زمین پر لال رنگ کے کنول پھول اور ان پر منڈراتی ہوئی تتلیاں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں نہ صرف یہ کہ پرانے پردوں کی جگہ نئے پردوں نے لے لی تھی بلکہ دوشیزہ نے پورے کمرے کی سٹنگ ہی بدل دی تھی، سامان خواہ وہی تھا لیکن صوفوں، تپائیوں، جہاں تہاں رکھی سجاوٹ کی چیزوں اور دیواروں پر ٹنگی تصویروں کو نئی ترتیب دینے ہی سے ڈرائنگ روم جگمگا اٹھا اس میں ایک عجیب شان ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔ نٹ راج کی کانسی کی مورتی جو ایک نایاب سہ پارہ تھی جسے شاید بہت پہلے اجنتا اور ایلورا کے یکتائے زمانہ فن کاروں نے بنایا تھا یوں زاویہ بدل کر رکھی گئی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی ہر شخص کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑتی تھی، کلینڈر کے دونوں

طرف رکھے دو ضعیف جن کی داڑھی سن کی طرح سفید اور کمر جھکی ہوئی تھی، تیز تیز قدموں سے چل رہے وقت کا احساس کراتے تھے۔

"کیا بات پیدا کی ہے اس سٹیڈنگ کا جواب نہیں" نریندر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بول اٹھا اور پھر ایک ایک چیز کو دھیان سے دیکھنے لگا۔

نٹ راج کی کانسے کی مورتی اور جھکی ہوئی کمر والے بوڑھوں کو دیکھتے ہی نریندر کی نظر اس گلدستے پر اٹکی جسے دوشیزہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور جس کے پھول پتے صبح سے شام ہو جانے پر بھی مرجھائے نہیں تھے،

نریندر جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا دوشیزہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی تھی اور اب قریب ہی کھڑی تھی۔ نریندر نے اس پر سوالیہ نگاہ ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو کہ پھول پتوں کے نہ مرجھانے کا سبب کیا ہے؟

"میں نے گلدان کے پانی میں چینی ملا دی تھی اس سے انہیں خوراک ملتی رہی اور اسی کارن تازگی بنی ہوئی ہے"

نریندر اگر چوکنا ہوتا تو پوچھ سکتا تھا کہ جب تمہیں اپنا نام تک یاد نہیں تو پانی میں چینی ملانا کیسے یاد رہ گیا۔ لیکن اسے پوچھنے کا ہوش ہی کہاں تھا وہ دوشیزہ کے مسکراتے ہونٹوں اور گھوم رہی پتلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ اس پر جادو کر رہا تھا۔

"تم بڑی ہوشیار ہو جی چاہتا ہے کہ یہ گلدستہ بنانے والے ان ہاتھوں کو چوم لوں"

دوشیزہ نے بلا تذبذب اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

نریندر کہنے کو تو کہہ گیا لیکن اس میں انھیں چھونے تک کی ہمت نہیں تھی وہ جھینپ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پتلیاں پھر گھومیں، ہونٹ پھر مسکرائے، دوشیزہ کی آنکھوں میں شوخی تھی اور اسی جذبہ کے مطابق مسکراہٹ بھی شوخ تھی جیسے کہہ رہی ہو 'جناب! خواہشات تو رکھتے

آگے بڑھنے میرے ان ہاتھوں کو چوم لینے میں کیا برائی ہے ؟"

دوشیزہ نے "ہاؤ ٹو سمائل" نام کی کتاب سے مسکرانے کے بہت سے انداز سیکھے تھے اور انھیں جانے کتنے مردوں پر آزمایا پرکھا تھا۔ اب اسے یہ بھانپ لینے کی مہارت ہو گئی تھی کہ کس مرد پر کس وقت مسکرانے کا کونسا انداز کارگر ہوگا۔ اس نے نریندر کی حقارت اور بے اعتنائی کو اس گھر میں آتے ہی بھانپ لیا تھا، اسے اپنی طاقت پر یقین تھا اور اس نے من ہی من کئی مرتبہ فخر سے دہرایا تھا" للو رام تم چاہے جتنا ہی بنو، جیت آخر میری ہو گی"

گدرایا جسم، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، بدلتی تھرکتی مسکراہٹیں اور دوشیزہ کی سوچی سمجھی جنگی حکمت سے نریندر بالکل ناواقف تھا، رفتہ رفتہ حقارت اور کشش میں توازن پیدا ہوا، پھر جیسے ستمبر کی ایک مقررہ تاریخ کو دن رات برابر ہونے کے بعد دن گھٹنے اور رات بڑھنے لگتی ہے ویسے ہی بے اعتنائی گھٹتی گئی اور دیکھنے میں سادہ اور معصوم اور حقیقت میں شوخ اور عیار دوشیزہ کا طلسمی اثر بڑھتا چلا گیا۔

دوشیزہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جس جذبے کا اظہار کر رہی تھیں وہ یکایک بدلا اور اس کے ساتھ ہی مسکراہٹ بدلی اس سے پہلے کی مسکراہٹ شوخ اور تیکھی تھی اور یہ مسکراہٹ محبت انگیز اور پرکشش تھی اس میں دوشیزہ کے ہونٹوں کی ساری تازگی ساری شیرینی سمٹ آئی تھی نریندر نے اس مسکراہٹ کے آگے بڑی آسانی سے ہتھیار ڈال دیئے۔

"بیٹھو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے" نریندر نے خود بیٹھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سبھدرا اور تیاگ راج دونوں اس وقت گھر میں نہیں تھے، شاید کسی میٹنگ یا پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ باہر اندھیرا تھا اور کمرے کے اندر بجلی کی روشنی تھی۔

نٹ راج کی کانسے کی مورتی کے دائیں بائیں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے چند لمحے خاموشی کے گذرے کیوں کہ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کھو" دوشیزہ کے ہونٹ ہلے اور ٹھوڑی کے نیچے ایک خوبصورت گڑھا بن گیا۔

"مجھے تمہیں پکارنے میں بڑی دقت ہوتی ہے" نریندر نے بات شروع کی۔

"اس لئے کہ میرا کوئی نام نہیں ہے"

نریندر چونکا لیکن بظاہر ضبط بنائے رکھا۔

"ہاں تمہیں اپنا پچھلا نام بھول گیا ہے کوئی دوسرا نام رکھ لیا جائے تو۔۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" دوشیزہ نے جواب دیا اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر نریندر کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر پھر بولی۔

"تمہیں جو نام پسند ہو خوشی سے رکھ لو"

"میری ہی پسند کیوں تمہاری اپنی پسند بھی تو کچھ ہو گی"

"میری پسند!" دوشیزہ طنزاً مسکرائی "جب وہ نام یاد نہیں آرہا جو ماں باپ نے بڑے لاڈ دلار سے رکھا تھا۔ جس کے ساتھ سگے سمبندھیوں کی یاد وابستہ تھی اور جس نے اب تک زندگی کا ساتھ دیا تھا۔ تو اب میری پسند کیا ہو گی۔ میری پسند اس نام کے ساتھ جاتی رہی ختم ہو گئی" اس نے گہری سانس چھوڑی۔

دوشیزہ کا کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ لگ بھگ وہی حالت ہو گئی جو فدوانی نگر میں دوشیزہ کی لاش کی خبر سن کر ہوئی تھی۔ نریندر من ہی من پچھتایا کہ وہ بار بار ایسی بات کیوں چھیڑ دیتا ہے جس سے دوشیزہ کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔

چند لمحے خاموشی کے گذرے دونو اضطراب محسوس کر رہے تھے جیسے ماحول میں پتھر کے کوئلے کا زہریلا دھواں بھر گیا ہو۔

"ہمارے دیس میں ویسے بھی رواج ہے" نریندر نے خاموشی توڑی "لڑکی جب بیاہی جاتی ہے تو سسرال میں اس کا کوئی دوسرا نام رکھ لیا جاتا ہے"

نریندر نے رواج کی یہ بات کہہ تو دی مگر اس میں 'سسرال' لفظ نے اسے چونکا دیا اور دوشیزہ سے آنکھیں چرا کر نٹ راج کی اور دیکھتا ہوا بولا "میرا مطلب ہے۔۔۔"

"نام بدل لینے میں کوئی برائی نہیں" دوشیزہ نے اس کے منہ کی بات چھین لی

اور وہ جو چند لمحے پہلے آہنی اداس تھی یکا یک کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

نریندر بھونچکا سا اس کے منہ کی اور دیکھنے لگا۔ دھوئیں کی جگہ اس کھل کھلاہٹ نے لے لی تھی اور ماحول میں سانس لینا آسان ہو گیا تھا۔

"تم نے رواج کی بات تو کہہ دی لیکن یہ کہنا بھول گئے کہ دوسرا نام رکھتے وقت لڑکی کی پسند کوئی نہیں پوچھتا۔"

دوشیزہ کی اس دلیل پر نریندر مسکرایا۔ بھدرسین کی تشبیہہ کی بنا پر اس نے نام پہلے سوچ لیا تھا اور اب اسے کہنے کی جرأت کی۔

"تمہیں اگر مدھو نام سے پکارا جائے تو کیسا ہے؟"

"مدھو نام بھی اچھا ہے۔" دوشیزہ نے گردن ہلائی۔ "ویسے نیرا، نرملا، نشا، نروپا یا سروج کیوں نہیں؟"

"مدھو" سے دوشیزہ کو اپنا میٹھا نام یاد آجاتا تھا جس سے اس نے چھٹکارا پا لیا تھا اور وہ دوبارہ کسی بھی نام کے بندھن میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اس لئے ایک ہی سانس میں اتنے ڈھیر سے نام گنوا دینے سے اس کا مقصد ناموں کی لایعنیت ثابت کرنا تھا اور وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اگر نریندر اپنی سہولت کے لئے اس کا کوئی دوسرا نام رکھ لینا ضروری سمجھتا ہے تو وہ 'م' کے بجائے 'ن' یا 'س' کسی دوسرے حرف سے شروع ہو تو بہتر ہے۔

"یوں تو نیرا اور نروپا ہی کیوں سشما، دیپا، ہمیشی، کامنی دنیا بھر کے نام ہیں ناموں کی کیا کمی ہے؟ لیکن تمہارے اتنے سارے نام ایک ساتھ کیسے رکھے جائیں؟"

نریندر اب موڈ میں تھا وہ دوشیزہ کی اور دیکھتے ہوئے ملیح انداز سے مسکرایا۔

"دونوں بہت خوش ہو کیا کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟"

سبھدرا کی آواز نے دوشیزہ اور نریندر دونوں کو چونکا دیا۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو" سبھدرا نے خود صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پتا جی کیا ابھی نہیں آئے ؟" نریندر نے ماں سے پوچھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" جواب ملا۔

"نئی بات یہ ہوئی ہے۔" نریندر نے دوشیزہ کی طرف دیکھا اور آگے کہا: "میں نے ان کا نام کرن کر دیا ہے۔ آپ کو پکارنے میں سہولت رہے گی۔"

"میں تو انہیں بیٹی کہہ کر پکارتی ہوں اور آگے بھی 'بیٹی' کہہ کر پکاروں گی۔" سبھدرا نے شفقت اور ممتا بھری نظر دوشیزہ پر ڈالی اور پھر نریندر کی طرف پلٹ کر پوچھا۔

"کیا نام رکھا ہے ؟"

"مدھو"

"دیکھیئے ماں جی ایسا نام رکھ دیا ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں۔" دوشیزہ نے کندھے اس انداز سے جھٹکے کہ سبھدا کو وہ شکایت کے بجائے تائید معلوم ہوئی۔

"بیٹی مجھے وشواس ہے کہ تم جو نام بھول گئی ہو وہ بھی "مدھو" ہوگا۔"

"تمہارے لئے یہ نام بالکل موزوں ہے۔"

"میرا نام مدھو نہیں 'مینا تھا مینا'" اس نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن بظاہر بولی۔

"ماں جی، چھوڑیئے پچھلی باتیں جو یاد ہی نہیں اس کی چرچا فضول ہے۔"

"سمجھ لیجئے یہ ان کا نیا جنم ہے اور مدھو نام بھی نیا ہے۔" نریندر نے دوشیزہ کی طرف دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔

"میرا یہ نیا جنم اس گھر میں ہوا ہے اور مجھے اب زندگی بھر یہیں رہنا ہے۔" دوشیزہ نے "یہیں" پر خاص زور دیا۔ وہ اور نریندر دونوں ہنسے، سبھدرا انہیں دیکھ کر مسکراتی رہی۔

---

(۸)

مدھو یعنی دوشیزہ نہا کر لوٹی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے میں قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی گیلے بالوں کو جھٹک رہی تھی اور بار بار بڑبڑا رہی تھی۔

" یہ کیسی دنیا ہے! بغیر ناموں کے جیسے اس کا کام ہی نہیں چلتا۔ میں نے ایک نام کو دفنایا اور مجھ پر یہ ایک دوسرا نام زبردستی چپکا کر دیا گیا۔ نہیں میرا کوئی نام نہیں، میں اسے بھی جھٹک دوں گی، میں نہ مینا تھی اور نہ مدھو ہوں، میں ہوں ناری، سمپورن ناری، جس میں مردوں کو بس میں کرنے کی عجیب طاقت ہے۔" اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔ دایاں ہاتھ بالوں کو جھٹکنے کے عمل میں اٹھ کر رک گیا تھا اور آنکھیں جو پھیلی ہوئی تھیں ان میں جیسے تمام تر طاقت سمٹ آئی ہو۔ اس نے بالوں کو زور زور سے جھٹکا اور پھر بڑبڑائی، " یہ نربھیا رجو کل تک بڑا اینٹھتا تھا موم کی ناک بن گیا ہے موم کی ناک۔" وہ مسکرائی اور بالوں کو پھر جھٹکا۔" نرا للو رام۔ نام کرن تو میں نے تیرا کیا ہے تو کیا میرا نام کرن کرے گا! میں ہوں سمپورن ناری۔ ہاہاہا۔ سمپورن ناری۔"

وہ بالوں کو زور زور سے جھٹک رہی تھی اور فاتحانہ انداز میں " ہاہاہا" ہنس رہی تھی، خوب ہنس لینے کے بعد اس نے سراپا آئینے میں دیکھا کچھ دیر ساکت کھڑی دیکھتی رہی "میں ہوں سمپورن ناری، سمپورن ناری!" اس نے بالوں کو جھٹکتے ہوئے دہرایا اور پھر اپنے آپ سے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ گھنی لانبی پلکیں اٹھا کر وہ کبھی اپنی پرچھائیں کو اپنے سے چھپا لیتی تھی اور کبھی پلکیں اٹھا کر دیکھنے لگتی تھی تو دیکھتی رہتی تھی اس کے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے کہہ رہی ہو " دیکھو، میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے "

اپنے آنکھ مچولی کا یہ کھیل بھی شاید اس کے سمپورن ناری ہونے ہی کا ثبوت تھا کیوں کہ آخر میں وہ پر مسرت انداز سے مسکرائی اور ایک بھرپور نظر اپنے اوپر ڈالی۔

"آپ کی چائے"

"اوہ، پان سنگھ" دوشیزہ نے پلٹ کر دیکھا اور حکم دیا" چائے تم یہیں لے آؤ۔"

آدھے آدھے بال دائیں اور بائیں کندھے پر سے آگے لاکر دونو ہاتھوں میں تھامے باری باری ایک نظر دونوں ہاتھوں کے بالوں پر ڈالی اور پھر ہونٹوں کا خوبصورت شیپ بنا کر دیکھنے لگی۔ اسے اپنا سراپا بے حد پرکشش دکھائی دیا۔

"سمپورن ناری! سمپورن ناری!" پھرکی کی مانند اپنے گرد گھومتی ہوئی وہ بلند آواز میں بولی۔

پان سنگھ نے سنا وہ ٹرے تھامے دہلیز پر رک گیا۔

"آجاؤ اور چائے رکھ دو"

اس نے اندر آکر چائے میز پر رکھ دی لیکن جب وہ لوٹنے لگا تو مدھو یعنی دوشیزہ نے حکم دیا۔ "رکو!"

پان سنگھ پلٹ کر دوشیزہ کی اور دیکھنے لگا۔

"تمہیں میرا نام معلوم ہے؟" دوشیزہ نے ایک مدھر مسکان اس کی طرف پھینکی۔

"نہیں" پان سنگھ نے انکار میں سر ہلایا۔

"تب تم کیا کہہ کر پکاروگے مجھے؟"

"چھوٹی بی بی جی" جواب ملا۔

"چھوٹی بی بی جی۔ مدھو، مینا، ہا ہا ہا۔ مینا، مدھو، چھوٹی بی بی جی، سلو، پان سنگھ"

پان سنگھ سراپا کان بنا سن رہا تھا۔ اور حیرت سے دوشیزہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میرا نام ہے سمپورن ناری سمجھے!"

پان سنگھ کچھ سمجھ نہیں پایا ۔ وہ ہکّا بکّا سا سر کھجلانے لگا ۔

"سمپورن ناری نام سنا ہے ؟"

"نہیں "۔

"کسی سمپورن ناری کو دیکھا ہے ؟"۔

" نہیں "۔

پان سنگھ مشین کی طرح جواب دے رہا تھا جیسے دوشیزہ نے اس پر جادو کر دیا ہو ۔

" تمہارے دیس میں کوئی ایسی لڑکی ہے جس سے تم نے پریم کیا ہو ؟"

" نہیں "۔

" پریم کرنا جانتے ہو ؟"

پان سنگھ پھر اکھڑ گیا اور چپ چاپ سر کھجانے لگا ۔

" تب تم کس لئے بھاگ کھڑے ہوتے ہو ۔؟ کیا کرو گے اپنے دیس جا کر ؟"۔

دوشیزہ نے پھر پوچھا اور پان سنگھ بیوقوف سا بنا اسکی طرف دیکھتا رہا ۔

پان سنگھ کی عمر اکیس بائیس برس تھی لیکن قد چھوٹا بدن اکہرا اور چہرے پر بچوں جیسا بھولپن اس لئے سترہ اٹھارہ سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا ۔ کانگڑہ کی اپنی ہری بھری خوشحال دھرتی اس سے تبھی چھوٹ گئی تھی جب اس کی عمر صرف دس گیارہ برس تھی اور وہ دلی آکر گھریلو نوکر کا کام کرنے لگا تھا ۔ سبھدرا اور تیاگ راج کو اس پر پورا بھروسہ تھا وہ اسے بیس، بیس روپے دے کر پھل، ترکاری اور ضرورت کی دوسری چیزیں ایک کاغذ پر لکھ کر بازار بھیج دیتے تو وہ سارا سامان صاف ستھرا اور ناپ تول میں پورا خرید لاتا تھا دوسرے نوکروں کی طرح اس پر کبھی چار آنے کی بھی ہیرا پھیری کا شک نہیں ہوا، تھا کئی مرتبہ ڈاکٹر تیاگ راج اپنے کنبے کے ساتھ کہیں باہر چلے جاتے تھے تو پان سنگھ اکیلا کوٹھی پر رہ جاتا تھا وہ کوٹھی کی رکھوالی کرتا تھا اور پیڑ پودوں کو سینچتا تھا ۔ تیاگ راج گھر کو جیسا صاف ستھرا چھوڑ کر جاتے تھے لوٹ کر ویسا ہی صاف ستھرا پاتے تھے، اس کی تنخواہ ہر مہینے گھر چلی جاتی تھی اسے روٹی کپڑا اور ضرورت کی دوسری چیزیں یہیں سے مل جاتی تھیں وہ اتنے ہی میں خوش تھا سبھدرا اور تیاگ راج بھی خوش تھے ۔ لیکن کبھی کبھی پا

ن

سنگھ کے من میں کچھ ایسا بھیانک ابال اٹھتا تھا کہ وہ کھونٹے پر بندھے الھڑ بچھڑے کی طرح رسّہ توڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کا بڑا بھائی سیتو بھی نئی دلی کسی کوٹھی میں یہی کام کرتا تھا وہ اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ تب اسے خواہ کتنا ہی سمجھایا جاتا وہ ایک ہی رٹ لگائے رہتا تھا "میں یہاں نہیں رہوں گا۔ مجھے گھر جانا ہے۔"

وہ گھر کبھی گیا ہی نہیں تھا لیکن سب کام چھوڑ چھاڑ کر یونہی ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا اور چار پانچ دن کے بعد اپنے آپ ہی لوٹ آتا تھا پھر سب حسب معمول ہونے لگتا تھا اور اسے کام میں جٹے دیکھ کر یہ سوچ پانا ممکن نہیں تھا کہ اس کے من میں بھی کبھی بغاوت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

مدھو یعنی دوشیزہ کے اس گھر میں آنے کے دس پندرہ دن بعد پان سنگھ کے من میں ایک بار ایسا ابال اٹھا تھا وہ تبھی سمجھ گئی تھی کہ یہ اس کی فطرت ہے اور سبھدرا اسی لئے پیسے اور چھٹی دے کر اسے بیچ بیچ میں گھومنے پھرنے اور تفریح کرنے بھیج دیا کرتی ہے۔

"بہت ہی عجیب شخص ہے"۔ ساری بات سننے کے بعد دوشیزہ کو بڑا تعجب ہوا تھا اور وہ پان سنگھ کے معصوم بھولے بھالے چہرے کی طرف تاکتی رہ گئی تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ اس آدمی کے دل میں بھی کہیں بغاوت کی چنگاری چھپی ہوئی ہے اور اس کی آتما بھی بندھنوں کو توڑ کر بھاگ جانے کے لئے بے قرار ہو اٹھتی ہے۔

دوشیزہ اس باغی عنصر کی ٹوہ لینا چاہتی تھی تبھی اس نے پوچھا تھا "کیا تمہارے دیس میں کوئی ایسی لڑکی ہے جس سے تم نے پریم کیا ہو؟ کیا تم پریم کرنا جانتے ہو؟"

لیکن سر کھجاتا ہوا پان سنگھ پہلے سے بھی زیادہ معصوم اور بھولا بھالا جان پڑا۔ دوشیزہ کی حیرت اور بڑھی اور اس نے پوچھا "تم گھر کیوں جانا چاہتے ہو۔ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟"

اپنی تکلیف۔ پان سنگھ خود نہیں سمجھ پاتا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ کانگڑہ کی ہری بھری وشال دھرتی اسے رہ رہ کر پکارا کرتی ہے۔ اس ہری بھری دھرتی پر چوالا مکھی دھدک رہا ہے۔ چوالا مکھی کا ایک ٹکڑا کہیں اس کے اندر بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ

ٹکڑا اس وشال جوالامکھی سے جا ملنے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے جس کا وہ ایک قدرتی جز ہے اور جسے پہاڑی دھرتی کے لال صدیوں سے پوجتے آئے ہیں۔ کیا وہ اس سے مل نہیں پائے گا؟ ہمیشہ الگ ہی رہے گا؟ یہ الگاؤ پان سنگھ کی آتما کو سالتا رہتا ہے اپنی دھرتی۔ اپنے جوالامکھی سے الگ ہو کر اس کا وجود دھول میں ملتا جا رہا ہے۔ اسے اکثر "نپو" یا "منڈو" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پان سنگھ خواہ سمجھ نہ پائے لیکن وجود کے مٹنے کو کیا انسان کبھی برداشت کر سکتا ہے؟ اس تکلیف کا بغاوت میں بدل جانا، لاوا بن کر پھوٹ نکلنا لازمی ہے، قدرتی بات ہے، دھرتی کے ان لالوں نے اپنی اس تکلیف کو جانے کتنی مرتبہ ایک بھیانک جوالا کا روپ دیا ہے۔ وجود کی حفاظت کے لئے جانے آج تک کتنی بغاوتیں کی ہیں، وجود کے کچلنے والوں کے خلاف وہ ہمیشہ جد و جہد کرتے آئے ہیں جب تک اس ہری بھری وشال دھرتی پر جوالامکھی دھدکتا رہے گا غریبی اور افلاس کے باوجود بغاوت کی آگ بجھ جانا اور جد و جہد کی روایت کا مٹ جانا ممکن نہیں ہے ان بغاوتوں کی تاریخ طویل ہے جسے کسی نے آج تک نہ سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور نہ لکھنے کی، پھر بھلا پان سنگھ اسے کیسے بتلا پاتا اور دوشیزہ بھی اسے کیسے سمجھ پاتی؟ نتیجہ یہ کہ بھولا بھالا پان سنگھ لاجواب سا ہو کر دوشیزہ کی طرف، اور دوشیزہ حیرت زدہ اور متعجب پان سنگھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اچھا تم جاؤ۔" دوشیزہ نے اسے حکم دیا۔

پان سنگھ چپ چاپ لوٹ آیا۔ مدھولیکھی دوشیزہ ساکت و حیران اسے دیکھتی رہی، آخر بالوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے پھینکتی ہوئی وہ بڑبڑائی، "تو بھی ایک پہیلی، میں بھی ایک پہیلی"۔

کندھے پر رکھے تولئے سے اس نے اپنا چہرہ پونچھا کیوں کہ گیلے بالوں کو جھٹکتے وقت کچھ بوندیں اس پر آ پڑی تھیں۔

چائے پیتے وقت بھی وہ اپنی اور پان سنگھ کی بات سوچتی رہی، اپنے سوالوں کو من ہی من دہراتی رہی اور آخر خالی پیالا میز پر رکھتے ہوئے ملندا آئی سے کہا۔

"در اصل یہ دنیا ہی ایک پہیلی ہے جو اسے بوجھے وہ نادان اور جو نہ بوجھے وہ بھی نادان۔"

---

(۹)

فروری کا مہینہ گذر رہا تھا۔ سردی جوبن پر آئی اور پھر ڈھلنے لگی، مدھو یعنی دوشیزہ اب ڈاکٹر گھرانے کا ایک فرد تھی چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے نہ اس کی یادداشت لوٹی اور نہ کسی طریقے سے پیچھے کی کھوج خبر ملی، دوشیزہ نے اب اس گھر کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ نریندر اور تیاگ راج کے ملاقاتی آتے تھے تو سبھدرا کی جگہ وہ ان کا سواگت کرتی تھی اور اپنے ہاتھ سے چاء بنا کر پلاتی تھی تیاگ راج کے معزز مہمانوں اور دوستوں کی باتیں وہ، چپ چاپ سنا کرتی تھی، جب بہت ضروری ہوتا تھا تبھی بولتی تھی اور سبھی اس کی شائستگی اور سلیقہ شعاری سے خوش ہو کر لوٹتے تھے لیکن نریندر کے نوجوان دوستوں کی محفل میں وہ چہکتی اور ہنسی مذاق میں کسی طرح پیچھے نہیں رہتی تھی وہ نہ صرف دوسروں پر پھبتی کس کر خوش ہوتی تھی بلکہ پھبتی جب خود اس پر کسی جاتی تھی تب بھی وہ خوش ہوتی اور اس کا مزا لیتی، دوست لوگ خوش ہو کر لوٹتے دوشیزہ کی حاضر جوابی، اس کی معصوم ہنسی اور اس کے تیکھے چبھتے فقرے یاد آ کر ان کے دلوں کو گدگدایا کرتے تھے۔

"میں اپنی طرف سے مدعو کرتا ہوں کافی اس اتوار کو نریندر کے گھر ہوگی!"

"واہ مدھو کے ہاتھ کی کافی مزا آجائے گا"

"ابے گھن چکر ویسے ہی مزا لے رہے ہو پہلے نریندر بابو سے تو پوچھو۔ وہ حامی بھریں تب نا"

"جب میں نے تمہیں کہہ دیا تو سمجھو دعوت پکی کیوں نریندر میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"تم کہو اور وہ ٹھیک نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے ؟"

نریندر مسکراتے ہوئے حامی بھرتا اور دوست منڈلی تھری چیئرز فار نریندر" کا نعرہ بلند کر کے تالی پیٹ دیتے۔

"تھری چیئرز فار سریش، جس نے تمہیں مدعو کیا ہے" سریش چھاتی پر انگلی رکھ کر اپنی طرف اشارہ کرتا۔

"اور تھری چیئرز فار مدھو جس کے ہاتھ کی بنی بین یون تک کا نشہ ہے"

مشترک آواز سنائی پڑتی اور پھر مشترک قہقہوں کی باڑھ سی آجاتی۔

شروع شروع میں ساتھ کام کرنے والوں کی چہل بازی نریندر کو بھی اچھی لگتی تھی اور ان کے قہقہوں سے دل خوش ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے چہل بازی چھیڑ خانی میں بدل گئی، قہقہوں سے طنز کی بدبو آنے لگی اور وہ اس کے دل پر پھولوں میں چھپے بچھوؤں کی طرح ڈنک مارنے لگے۔

ساتھ کام کرنے والوں میں نریندر سریش پر اپنا سب سے زیادہ حق سمجھتا تھا اس نے ایک دن یوں ہی تجسس میں پوچھا تھا "یہ مدھو کون ہے کیا تمہاری کوئی رشتے دار ہے ؟"

"رشتے دار تو نہیں لیکن اب رشتے دار سے بھی زیادہ ہے" نریندر نے سہج سبھاؤ جواب دیا تھا۔ بات جب چل پڑی تو یہ بھی بتایا کہ مدھو نام کی یہ نوجوان لڑکی کیسے سڑک پر بے ہوش ملی، کیسے اسے اٹھا کر کوٹھی پر لایا گیا اور جب بے ہوشی ٹوٹی تو اسے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔ وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔ "اس کا مدھو نام بھی میں نے ہی رکھا ہے" پوری کہانی سنا دینے کے بعد نریندر نے فخریہ کہا تھا۔

سریش کا رنگ سانولا۔ اور گال کچوری کی مانند پھولے ہوئے تھے جسم بھاری اور قد ناٹا ہونے کے باعث وہ مگدر سا دکھائی پڑتا تھا۔ لیکن وہ دنیا داری اور رواداری کی آمیزش سے بنا خوش مزاج شخص تھا۔ نریندر جب سوستکا لمیٹڈ میں آیا تو وہ اسے بڑے تپاک سے ملا اور اس کے ساتھ پہلے دن ہی دوستی گانٹھ لی، وجہ

یہ کہ دوستوں کی تعداد بڑھانے اور ہر دل عزیز بننے میں اس کی خاص دلچسپی تھی نریندر کو اس کا رویہ پسند آیا، اس نے بھی دوستی نبھائی اور وہ رفتہ رفتہ قریب آتا چلا گیا، لیکن کئی مرتبہ کرنٹ سا لگتا اور وہ پیچھے ہٹ جاتا، تب اسے سریش میں اور اپنے میں ایک ایسا فاصلہ محسوس ہوتا، جسے طے کر لینا اس کے بس میں نہیں تھا، دراصل یہ فاصلہ اس کے اور سریش کے فطری میلان کا فرق تھا۔ سریش کی پرورش جس گھرانے اور ماحول میں ہوئی تھی وہ نریندر کے اپنے گھرانے اور ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ سریش کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو ہندوستانی ہو کر بھی "ہندوستانی" نہیں تھا جس نے آج سے لگ بھگ ایک صدی پہلے انگریز کے ہندوستان آنے کو خدائی عطیہ اور مغربی طور طریقہ اپنا لینے کو تہذیب و ترقی سمجھ لیا تھا برٹش راج ہی میں ان لوگوں کا ایک الگ سماج بن گیا تھا جو ہوٹلوں، کلبوں اور پارٹیوں کا سماج تھا، کھاؤ، پیو عیش کرو، ان کا فلسفۂ حیات اور دنیا کا سچ جھوٹ اور جھوٹ سچ ہے کہنے والا نٹشے ان کا سب سے بڑا دانشور تھا۔ انھیں نہ ماضی سے لگاؤ تھا اور نہ مستقبل کی فکر، سریش کو جو کچھ وراثت میں ملا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ کل کی فکر بے ہودہ ہے، آج اگر اچھا ہے تو سمجھ لو کل بھی اچھا ہوگا۔ اس کا جسم ہی کثیف نہیں تھا خیالات اور جذبات بھی کثیف تھے۔ تفریح کا معیار یہ تھا کہ غیر قانونی طور پر درآمد ہونے والی بلیو فلمیں نہ صرف اسے گھر کے دوسرے افراد کو بھی بے حد پسند تھیں بلکہ وہ دوستوں کو بھی گھر پہ بلا کر دکھایا کرتا تھا لیکن سریش کی ان فلموں میں جتنی رغبت تھی نریندر کو اتنی ہی نفرت تھی۔

سوستکا لمیٹڈ میں اس کے ساتھ کام کرنے اور رہنے کو دوست ہوتے ہوئے بھی سریش اور نریندر کی فطرت میں جو فرق تھا وہ کئی بار من مٹاؤ کا باعث بن جاتا تھا نریندر جانتا تھا کہ سریش کے دل میں کسی طرح کا بغض یا کینہ نہیں ہے اور وہ سچ مچ دوستوں کا دوست ہے تاہم اس کے رویے اور اس کی بات چیت سے نریندر کئی مرتبہ اتنا چڑ جاتا تھا کہ آئندہ اس شخص سے کوئی بھی واسطہ نہ رکھنے کا ارادہ کر لیتا تھا لیکن دوسرے ہی دن جب سریش ہیلو ڈارلنگ کہتے ہوئے آگے بڑھتا تو نریندر سارے شکوے گلے بھول

جاتا تھا اور اس کے ساتھ دوبارہ گھی شکر ہو جاتا تھا۔

اب جب اس نے مدھو کی بات چھیڑی تو نریندر نے اس سے کچھ بھی چھپایا نہیں اور نہ ہی چھپانے کی ضرورت محسوس کی۔ سیدھی سی بات جیسی کی ویسی کہہ سنائی لیکن جب سریش نے اسی بات کو بڑھا چڑھا کر نمک مرچ لگا کر اسے اپنے ڈھنگ سے بیان کیا تو وہ فیکٹری بھر میں چرچا اور تفریح کا باعث بن گئی۔

"سنا تم نے، یہ نریندر بڑا شریف بنتا ہے۔"

"کیوں کیا کچھ گول مال پکڑا گیا ہے؟"

"ایک دم چھپا رستم نکلا، ہم فلم جانے کو کہتے ہیں تو وہ ناک بھوں چڑھا کر جواب دیتا ہے میں ایسی واہیات فلمیں نہیں دیکھتا، عورت کے جس روپ پر تم لوگ اتنے لٹو ہو مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔۔۔"

"بڑا برہمچاری بنتا ہے اور کہتا ہے میں شادی نہیں کروں گا۔"

"اسے شادی کی ضرورت ہی کیا ہے! بغیر شادی کئے ہی ایک لاجواب چیز گھر میں رکھ چھوڑی ہے۔"

"اچھا! اسے دیکھا ہے تم نے؟"

"دیکھا نہیں تو کیا، سنا تو ہے، وہی مدھو جو بڑھیا کافی بنا کر پلاتی ہے۔ دوستوں کی محفل میں بلبل کی طرح چہکتی ہے۔ اسے نریندر نے رکھیل بنا رکھا ہے۔"

"ہیں۔ رکھیل؟"

"ہاں، اگر یقین نہ آتا ہو تو یہ آگئے نریندر بابو پوچھ لیجئے خود انھیں سے۔"

صبح صبح دفتر کا کام شروع ہونے سے پہلے فیکٹری کے عملے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اتنے میں نریندر بھی آپہنچا اور سب کی سوالیہ نگاہیں اسکی طرف اُٹھ گئیں۔

"سناؤ بھائی، کیا حال ہے تمہاری اس مرغی کا؟" اسی شخص نے پوچھا جس نے آتے ہی بات شروع کی تھی۔

نریندر ہکا بکا اس کے منہ کی جانب دیکھنے لگا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

"دیکھا، چوری پکڑے جانے پر چور اسی طرح چونکتا ہے" لمبوترے چہرے اور سڈول جسم کا وہ شخص طنزاً مسکرایا۔

"کیا بات ہے؟ کیسی مرغی، کیسی چوری؟"

نریندر کے لہجے میں گھبراہٹ تھی اور غصہ بھی۔

"یار ناراض کیوں ہوتے ہو۔ اسی لڑکی بات ہے جو کافی ایک دم بہت بڑھیا بناتی ہے اور جس کا نام تم نے مدھو رکھ چھوڑا ہے۔"

جواب سریش نے دیا اور اس شرمندگی پر جو نگاہ ڈالی وہ نریندر کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی۔

"مدھو کو مرغی کہنے کا کیا مطلب!" نریندر کی بھویں تن گئیں۔

"میرے دوست خود تمہیں نے تو بتایا تھا کہ وہ تمہاری رشتے دار نہیں لیکن اب رشتے دار بھی زیادہ ہے" سریش نے نریندر ہی کی بات دہرائی اور آگے کہا۔ "اس رشتے دار بھی زیادہ کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے!"

یہ تم خود سمجھ لو پڑھے لکھے آدمی ہو انجینئرنگ پاس کر رکھی ہے"

سب کے مشترک قہقہے نے دفتر کی دیواریں ہلا دیں، نریندر کی حالت شکاریوں سے گھرے اس جنگلی ہرن جیسی تھی جس کے لئے بھاگنے کے سبھی راستے بند کر دیئے گئے ہوں، اس نے سریش کی طرف شکوہ آمیز نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "یہ تمہارا کیسا رویہ ہے تم نے حقیقت کو جھوٹ کا روپ دے دیا ہے اگر اسی کا نام دوستی ہے تو پھر دشمنی کسے کہتے ہیں؟" لیکن سریش کو ان نگاہوں، اور ان میں بھرے شکوے شکایت کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی نریندر کو پریشان ہوتے سٹ پٹاتے دیکھ کر مزا آ رہا تھا۔ زندگی کو تفریح بنا دینے کا ایسا موقعہ قسمت ہی سے ہاتھ لگتا ہے۔

جس سماج میں بھونڈا مذاق ہی نمایاں عنصر ہو اور اسے ان لوگوں نے جو اپنے کو تعلیم یافتہ کہنے میں خاص صفت سمجھ کر اپنا رکھا ہو اس میں لطیف جذبات کا کسی

کسی ایک شخص کی نیکی اور پاک دامنی کی کیا قیمت ہے ۔کثیف ہنسی مذاق ان کی ذہنی خوراک بن چکی ہے مکھی کو خوشبو سے کیا لینا دینا ۔ وہ غلاظت کھاتی ہے اور غلاظت پر بیٹھتی ہے۔

نریندر پر روز بروز کسی نہ کسی پہلو سے طنز یہ چوٹیں ہونے لگیں اور اسے دفتر میں بدبو بھرے کثیف مذاق کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ سٹ پٹا کر رہ جاتا تھا اس سے نہ کچھ کہتے اور نہ کرتے بنتا تھا ۔کئی بار سوچا کہ لمبی چھٹی لے لے اور اس ماحول سے دور سے بہت دور بھاگ جائے لیکن چھٹی مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا کون کہہ سکتا ہے کہ جہاں جائے گا وہاں بھی یہی ماحول نہیں ہو گا۔

" یار ایسی کیا ناراضگی ہے ؟ کیا اب کافی بالکل نہیں پلاؤ گے ؟ " نریندر خواہ چڑا ہوا تھا اور کھنچا کھنچا رہتا تھا لیکن سریش کا چہرہ حسب سابقہ کھلا ہوا تھا اور اس کے رویے میں کچھ بھی فرق نہیں آیا تھا۔

" چھوڑو ان باتوں کو میں نے تمہارے جیسا آدمی نہیں دیکھا " نریندر نے خفگی کا اظہار کیا اور منہ دوسری طرف گھما لیا۔

سریش ہنسا ، خوب ہنسا اور وہ اپنے منہ کا پان تھوک کر بولا ۔" دوست ، تم نے یہ سو روپے کی بات کہہ دی ، دنیا میں جب میرے جیسا کوئی دوسرا آدمی ہے ہی نہیں تو تم دیکھتے کہاں سے ؟ "

اس نے شکوے کو ہمیشہ کی طرح مذاق میں اڑا دیا لیکن نریندر گردن موڑے بیٹھا رہا کیوں کہ اس بار جو گھاؤ لگا تھا وہ پہلے سے گہرا تھا۔

" پیارے بتاؤ تو سہی کہ ایسی کیا گستاخی ہو گئی کہ تمہیں ہماری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں ہے ؟ " وہ اٹھا اور نریندر کی ٹھوڑی پکڑ کر اسے ہلانے لگا۔

" چھوڑو بھی " نریندر مسکرایا۔

" لو چھوڑ دیا ۔ بتاؤ بات کیا ہے ؟ "

" بات وہی ہے جس کی ہر روز چرچا ہے " نریندر نے آہستہ آہستہ کہا ۔اس کے لہجے میں اب بھی تلخی گھلی ہوئی تھی اور دوست سمجھا لیکن تم نے میرے لئے

کانٹے بو دیئے، یہ گستاخی نہیں گستاخی سے زیادہ ہے دوست سے غداری ہے میں سمجھتا ہوں، تم کسی طرح بھی وشواس کے قابل نہیں ہو۔"

"اہا۔ہا" سریش کھکھلا کر ہنس پڑا۔

وہ دونوں ٹریکٹر کے ایک نئے سمپل کا معائنہ کر کے ورک شاپ سے لوٹے تھے اور سریش کے کمرے میں بیٹھے چاء پی رہے تھے، سریش نریندر کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہتا چلا گیا "میرے دوست تم میں یہی کمی ہے کہ تم اپنے آپ کو ماحول کے مطابق نہیں ڈھال پاتے بے کار سوچتے ہو اور ذراسی بات من کو لگا لیتے ہو ورنہ جب دوسرے ہنستے ہیں تم بھی ہنسو، "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کو اپنا اصول بنالو"

"یہ بھی خوب رہی کہ میں اپنے آپ پر ہنسوں۔ بھدّی اور بھونڈی باتوں پر خوش ہو کر دوسروں کی نظر میں تماشا بنوں"

"نریندر، میری بات یاد رکھو زندگی میں کچھ بھی فضول نہیں ہے اگر تم ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتے تو اس مدھو نام کی لڑکی سے شادی کر لو سب کے منہ بند ہو جائیں گے" وہ ذرا دیر رکا اور نریندر کے کندھے پر کوہنی رکھ کر بولا "تمہارے چڑچڑے پن کا بھی یہی ایک علاج ہے پھر مدھو جیسی حسینہ تمہارے ہاتھ اتفاق سے لگ گئی اپنی قسمت کو دعائیں دو۔ تم میں ہمت نہیں تو اس سے پوچھ لو میں ہر جوکھم اٹھا کر دوسری شادی کرنے کو تیار ہوں"

سریش مسکرایا، اس مسکراہٹ میں طنز نہیں تھا ایک ایسے شخص کا غرور تھا اپنی سمجھ بوجھ پر اترانا جسکی فطرت بن چکی ہو، جس کی موٹی کھال میں احساس کا کانٹا نہ کبھی چبھا ہے اور نہ چبھنے کا امکان ہے۔

---

(۱۰)

سنگیت کے بول کیا ہیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں، اس میں سُر اور تال ہی سنگیت ہے۔ دل کے کومل اور لطیف جذبات کو چھونے سے جو سنگیت پیدا ہوتا ہے اسی کا ایک دوسرا نام مسرت ہے سُر تال کی تخلیق بھی انہیں جذبات کو چھونے کی غرض سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تیاگ راج آج بہت خوش ہیں وجہ یہ کہ کینیڈا سے اس کے بڑے لڑکے جیتندر کا خط آیا ہے خط کے ساتھ پپو اور منی کے فوٹو آئے ہیں دونوں بچے گول مٹول اور تندرست ہیں۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا خط پپو کا لکھا ہوا ہے۔ اس نے اپنا "پپو" نام ٹیڑھے میڑھے حروف میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے" دادا کو میری نمستے، میں آپ کی گود میں بیٹھ کر آپ سے باتیں کروں گا"، پپو نے ابھی سال، سوا سال پہلے پڑھنا شروع کیا ہے ہندی شاید للنی نے اسے گھر پہ سکھائی ہے۔

جیتندر بچوں کے فوٹو سال میں دوبار ضرور بھیجتا ہے دادا، دادی انہیں فیملی البم میں لگا لیتے ہیں، اس البم کی ان کے لئے کسی بھی دھارمک گرنتھ سے زیادہ اہمیت ہے دونوں اس البم کو فرصت کے وقت اکثر لے بیٹھتے ہیں۔ اس میں لگی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں، محض ان تصویروں کو دیکھ لینے سے جمود اور اداسی دور ہو جاتی ہے اور اس بڑھاپے میں بھی وہ اپنے اندر تازگی اور مستعدی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اتوار کو ممّا اور پاپا پانچ بجے کا وقت، ڈاکٹر گھرانے کے سبھی افراد اور

بھدرسین ڈرائننگ روم میں بیٹھے تھے اور یہ البم ان کے درمیان میز پر رکھا ہوا تھا جیتندر کے خط کو آئے چار دن گذر چکے تھے لیکن اس وقت اسی کا ذکر چل رہا تھا، بچوں اور للنی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں اسی وقت سومناتھ سہگال نام کا ایک واقف کار ڈرائننگ روم میں داخل ہوا۔ اور بولا "موسم ایک دم بدل گیا ہے۔ باہر بدن کو چیر کر نکل جانے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔"

"شملہ میں برف پڑی ہے اور اسی سے پورے شمالی ہندوستان میں سرد لہر دوڑ گئی ہے۔" نریندر نے بات میں بات ملائی۔

"اکثر ایسا ہوتا ہے، سردی جاتے جاتے دو چار دن کیلئے پھر لوٹ آتی ہے۔" بھدرسین نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور برف گرنے کے باعث تھرپیچر بدلنے کی تشریح شروع کردی۔

سہگل کی اس میں دلچسپی نہیں تھی، وہ البم اٹھا کر اس میں لگی تصویریں دیکھنے لگا، بھدرسین کو اپنی بات درمیان چھوڑ دینی پڑی۔

"پپو اور منی کے نئے فوٹو آئے ہیں دیکھے آپ نے" ڈاکٹر تیاگ راج نے سہگل کا دھیان فوٹوؤں کی طرف دلایا۔ پچھلے چار دن سے وہ اپنے ہر ملاقاتی کو یہ فوٹو دکھا رہے تھے اور ان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"بہت سندر" سہگل نے فوٹو دیکھتے ہوئے کہا۔ "منی نے بھی خوب پوز بنا رکھا ہے، دیکھو تو کیسے مسکرا رہی ہے۔ اب تو وہ چھپر پٹر بولتی ہوگی۔"

"ڈیڑھ دو سال کی ہو گئی بات کیوں نہیں کرے گی۔ پر ہم تو انکی آواز تک سننے کو ترس جاتے ہیں۔" سبھدرا نے حسرت زدہ لہجے میں کہا اور جانے کیوں گردن گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ سبھدرا کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے آخری فقرے کو فضا میں گونجتے ہوئے سن رہے تھے یہ فقرہ نہیں ایک مختصر نظم تھی جس میں انسانی دل کے کول اور لطیف جذبات سمو دیئے گئے تھے۔

"اور یہ پپو کا خط ہے جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے"

تیاگ راج نے پوتے کا ننھا خط سہگل کی طرف بڑھا دیا وہ بچے کی تحریر اور ٹیڑھے میڑھے حروف کو دیکھ کر مسکرایا اور پھر خط پڑھ کر بولا، "یہ گود میں بیٹھنے کی بات اگر پپّو کے منہ سے سنی ہوتی تو کیسی پیاری لگتی"

"بچے کی توتلی زبان معمولی کو بھی غیر معمولی بنا دیتی ہے اس کے منہ سے نکلا بے معنی لفظ بھی بامعنی بن جاتا ہے — مدھر سنگیت جان پڑتا ہے"

جیسے پہلے سبھدرا کی طرف دیکھا تھا اب کے سب نے مدھو یعنی دوشیزہ کی طرف دیکھا۔ لیکن دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا اور نظریں بدل گئی تھیں وہ ایک بچے کی طرح مسکرا رہی تھی اور اس کے بول کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

نریندر جب مدھو کی طرف دیکھ رہا تھا تو اسے یکایک اپنے رفیق سریش کی بات یاد آگئی "مرد بنو اور اس سے شادی کرلو۔ تمہارے چڑ چڑے پن کا بھی یہی ایک علاج ہے۔"

"نریندر تم کیا سوچ رہے ہو، کہیں بہت دور چلے گئے معلوم ہوتے ہو" سبھدرا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ حضرت شاید بھائی اور بچوں کے پاس کینیڈا پہنچ گئے ہیں" سہگل دور کی کوڑی لایا اور اپنی بات پر آپ ہی ہنسنے لگا۔ لیکن جب کسی نے ہنسی میں ساتھ نہیں دیا تو وہ ڈاکٹر تیاگ راج کی جانب پلٹ کر پھر بولا۔

"جیتندر کو ماتری بھومی کی یاد کیا بالکل نہیں آتی؟ کیا وہ کینیڈا ہی کا شہری بن گیا ہے؟ کیا اسے وطن لوٹنے کا خیال ہی نہیں آتا؟"

سومناتھ سہگل ایک مقامی کالج میں اقتصادیات کا پروفیسر تھا، رنگ سانولا ہونٹ موٹے، لمبا تڑنگا اور اونچا ڈیل ڈول۔ اگر وہ شروع ہی سے مکے بازی کی مشق کرتا تو شاید آج اس فن کی مشہور عالم ہستی محمد علی کا حریف بن گیا ہوتا۔ ڈاکٹر تیاگ راج کے پاس وہ ہفتے میں تین چار مرتبہ ضرور آتا تھا جب وہ طالب علم تھا تبھی ان سے نزدیکی تعلق قائم کیا تھا اور یہ تعلق اس کے لئے پروفیسری کے ذاتی معاملے میں اور بائیں بازو کی تحریک کے پبلک معاملات میں ہمیشہ سودمند رہا تھا۔ اس لئے

ڈاکٹر تیاگ راج سے عقیدت میں اس نے تینوں سوال بیک وقت ہوا میں یوں اچھال دیئے تھے جس میں اقتصادیات کے اصول پڑھاتے وقت کلاس میں ایک کے بعد ایک فقرہ اچھالا کرتا تھا، اس کے چہرے پر کسی طرح کا اتار چڑھاؤ نہیں آیا اس کا چہرہ حسب سابق جذبات سے عاری خشک بنا رہا۔

لیکن تیاگ راج نے اپنی سمور کی ٹوپی سر سے اتاری۔ اسے یونہی ایک نظر دیکھا اور دوبارہ اوڑھ لیا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور گھٹنے زور زور سے ہل رہے تھے۔

"جیتندر ہمارا پہلوٹھی کا بیٹا ہے۔ نریندر اس کے سات آٹھ برس بعد پیدا ہوا تھا۔ ہم دونوں اسے کتنا چاہتے تھے کتنا پیار کرتے تھے اس نے جیسے وہ سب بھلا دیا ہے۔" سبھدرا کا گلا رندھ آیا اور انہوں نے گہری سانس چھوڑی۔

چند لمحے خاموشی کے گذرے، نریندر کبھی ماں اور کبھی باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید دل میں سوچ رہا تھا کہ ماں کو جہاں جیتندر سے شکایت ہے وہاں اس سے بھی ہے، اس نے ماں کی بات کب سنی اور کب اس کے جذبات کا احترام کیا۔

"ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں پیسہ اہم ہے انسان پیسے کے لئے جانے کہاں کہاں سے کہاں بھاگا پھرتا ہے جہاں بھی اسے زیادہ پیسہ ملے وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے اسے نہ پھر ماں باپ کی فکر رہتی ہے اور نہ دیس کی یاد ستاتی ہے پیسے نے انسان کو ایسا چھیلا تراشا ہے کہ اسے "رابوٹ" بنا دیا ہے۔" ڈاکٹر تیاگ راج نے آہستہ آہستہ کہا جب کہ ان کے گھٹنے اب بھی زور زور سے ہل رہے تھے۔

"رابوٹ"! مدھو نے دہرایا اور چھاتی پر بازو کس کر ایسی صورت بنائی کہ نریندر سہگل اور بھدر سین تینوں کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ پھیل گئی اس مسکراہٹ کا تعلق انسان سے نہیں اس کے رابوٹ روپ سے تھا۔

"جیتندر کو پیسے کی یہاں بھی کیا کمی تھی؟ آپ لوگوں نے بہت کمایا اور خود اسے بھی ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی نوکری آسانی سے مل جاتی۔" سہگل بولا۔

"کمی چاہیے کچھ نہیں تھی پر ایک حرص ہے اندھی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس میں

ہر ایک شخص دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔" بھدرسین نے سہگل کی بات کا جواب دیا اور نریندر کی اور پلٹ کر آگے کہا " انجنیئر، ڈاکٹر، پروفیسر جیسے دیکھو ودیش جانے کے لئے بے چین ہے اسے نہ وطن کی پروا ہے اور نہ کسی عزیز رشتہ دار کی۔ 'اگلے کھینچ لے ڈور پچھلے پچھلے لے گئے چور' کا شور مچا ہوا ہے۔"

پان سنگھ نے پیالے پلیٹیں لاکر میز پر رکھیں۔ مدھو بھی اٹھ کھڑی ہوئی اس نے کاجو، بسکٹ وغیرہ لانے میں پان سنگھ کی مدد کی اور چائے بنا کر سب کے سامنے رکھی۔

" اگر نریندر شادی کر لیتا، اس کے بچے ہوتے تو جیسے اپنے بچوں میں رہ کر وہ ہمیں بھول گیا ہے شاید ہم بھی اسے بھول جاتے " سبھدرا نے بھرائی آواز میں کہا۔ چائے کی ایک چسکی لی اور سب سے نظر ہٹا کر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

" نریندر، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اپنی بے کار کی ضد چھوڑو اور شادی کر لو، تمہیں اپنا خیال نہیں تو ماں باپ ہی کا خیال کرو اور انہیں کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پی لو۔"

سہگل 'کڑوا گھونٹ' محاورے کے استعمال پر پروفیسری انداز سے مسکرایا اور داد پانے کے لئے اس نے پہلے نریندر اور پھر مدھو کی طرف دیکھا۔

سہگل کے اس اچانک دیکھنے سے بھدرسین کے دماغ میں ایک خیال کوند گیا اور اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک اٹھی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ایک لمحہ سوچا اور پھر سبھدرا کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

" سہگل نے بڑا اچھا سجھاؤ دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر نریندر مان جائے تو مدھو کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

بات چاہے دھیرے کہی گئی تھی لیکن سن کر سبھی چونک گئے جیسے کانچ کی کوئی بھاری چیز گر کر ٹوٹ گئی ہو یا کوئی دھماکہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ سبھدرا چونکی جو کبھی پتی کبھی نریندر اور کبھی مدھو لیکن دو شیزہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

" ڈاکٹر، ہاتھ ملاؤ ۔ دراصل میں بھی یہی بات کہنا چاہتا تھا ۔ پر کہہ نہیں سکا یوں کہو کہ تم نے میرے منہ کی بات چھین لی "۔ سہگل نے جوش میں بھر کر ہاتھ آگے بڑھایا جو بھدرسین نے تپاک سے تھام لیا ۔" اگر ہم چراغ لے کر نکلیں اور دھرتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم آئیں تب بھی مدھو جیسی لڑکی نہیں ملے گی، ماڈرن، پڑھی لکھی، سوشیل، سبھی گن ہیں اس میں، اتفاق سے جوڑی بن گئی ہے"

سہگل خوشی سے اچھل پڑا اور پلیٹ سے کاجو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا ۔

" وہ معاملہ ہے مدھو اور نریندر کا ۔ جوڑی تم بنا رہے ہو، ان سے تو پوچھ لو "

بھدرسین نے بات سہگل سے کہی لیکن دیکھ وہ رہا تھا نیاگ ساج، سبھدرا کی طرف، جیسے جاننا چاہتا ہو کہ اس بارے میں ان کی کیا رائے ہے لیکن وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

" آج کل کے لڑکے لڑکیوں کے سر پر بیاہ نہ کرنے کی جو سنک سوار ہے اسے میں دنیا سے بے اعتنائی، ذمے داری سے بھاگنے کا رجحان سمجھتی ہوں جو جذبات سے عاری ہو جانے سے " روبوٹ " بن جانے کا نتیجہ ہے "۔ سبھدرا نے پیالہ میز پر رکھ دیا ۔ اور مدھو کے چہرے پر نگاہ مرکوز کر کے پوچھا " کیوں بیٹی، تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ "

مدھو سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑا اس نے حیا سے آنکھیں جھکا لیں ۔

" خاموشی کا مطلب ہے رضامندی ۔ نریندر تم بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے؟ " سہگل نے میز تھپ تھپائی ۔

نریندر تذبذب میں پڑا سوچ رہا تھا کہ ادھر دفتر میں کھلی اڑتی ہے اور ادھر اس کے بیاہ نہ کرنے کو بے کار کی ضد بنایا جا رہا ہے ۔ جس عہد سے ماں باپ دکھی ہوں اور خود اسے مغرور اور سنکی سمجھا جا رہا ہے ایسے عہد سے کیا فائدہ؟ رہا مدھو کا سوال، سبھی اس کی تعریف کرتے ہیں اور سبھی چاہتے ہیں کہ میرا اور اس کا بیاہ ہو جائے اور وہ اس گھر کی بہو بنے

سہگل نے جب میز تھپ تھپائی نریندر یکایک اپنی سوچ میں سے ابھرا اور کمر سیدھی کر کے بول اٹھا:۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ ....."

اور وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر مدھو یعنی دوشیزہ کی طرف دیکھنے لگا۔

مدھو کب چوکنے والی تھی، اس کے نئے رول کا یہ نکتۂ عروج تھا اور پہلے ہی وہ اس موقع کا انتظار کر رہی تھی اس نے گردن اوپر اٹھا کر پختہ ارادے سے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ ماتاجی اور پتاجی کو کوئی اعتراض نہ ہو"

تیاگ راج اور سبھدرا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا انہوں نے مدھو کو اتنے دن میں بخوبی دیکھ پرکھ لیا تھا۔ وہ اس کی سلیقہ شعاری سے خوش تھے اور سب سے بڑی مسرت یہ تھی کہ نریندر کا بیاہ دیکھنے کی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی تھی، دونوں کی بوڑھی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرے کھل گئے۔

---

(۱۱)

نرہندر کا بیاہ کسی دھارمک ریت کے بجائے اس جدید طریقے سے ہوا، جسے ’سول میرج‘ کہتے ہیں۔ اس نے فیکٹری سے ایک مہینے کی چھٹی لے لی اور نئی نویلی دلہن کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ لگ بھگ دو ہفتے سری نگر میں گذارے، رہائش کا انتظام ہاؤس بوٹ میں کیا تھا کشمیر کی اس حسین وادی میں جہاں جہلم ندی شہر کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی بہ رہی ہے ڈل جھیل دور افق تک پھیلی ہوئی ہے اور پربتوں پر لمحہ بہ لمحہ شکل بدلنے والے بادل منڈرایا کرتے ہیں وہاں ہنی مون منانے میں کتنا لطف کتنا مزا تھا۔ وہ کبھی ڈونگے میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے اس کے نیلے صاف پانی میں اُگی ہوئی لانبی لانبی گھاس سے کھیلتے کبھی جنگلی ہرن ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے پہاڑوں پر چڑھتے اترتے اور کبھی چنار کے سائے میں ہری ہری نرم گھاس پر آمنے سامنے ادھ لیٹے مستقبل کے نقشے بناتے اور میٹھے سپنے دیکھتے تھے وہ ہر طرح آزاد اور بے فکر تھے، دل چاہا ہاؤس بوٹ میں آرام کیا دل چاہا پہن اوڑھ کر گھومنے نکل گئے اور پھر دن بھر من مرضی سے گھومتے رہے۔ کوئی فکر نہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

”مدھو ڈارلنگ! تمہیں یادداشت کھو کر نئی زندگی ملی اور مجھے تمہیں پاکر نئی زندگی ملی“ نرہندر نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔

انہیں سری نگر آئے ابھی صرف دو دن ہوئے تھے وہ کھلے میں ایک چنار کے نیچے بیٹھے تھے جھیل تھی اور اس سے پرے شنکر آچاریہ کا مندر تھا

جیسے وہ دیکھ آئے تھے ایک سندر ننھی چڑیا چہچہاتی ہوئی ان کے اوپر سے گذر گئی،

"تمہاری اس نئی زندگی پر مدھو کی یعنی میری بہت بہت مبارکباد۔" مدھو نے مسکراتے ہوئے کہا اور پلکیں اٹھا کر آنکھیں پوری پھیلا دیں۔

"اس خوشی میں کوئی شعر ہو جائے۔"

"شعر!"

"ہاں شعر۔ لیکن انجینئر اور شعر کا کیا رشتہ۔" مدھو کے ذہن میں "بندر کیا جانے ادرک کا سواد" محاورہ ابھر آیا۔ لیکن وہ اسے کہتے کہتے رک گئی۔

"ڈارلنگ ایسی بات نہیں بھدر سین کی ادب اور آرٹ میں بڑی دلچسپی ہے انہیں بہت سے شعر یاد ہیں اور میں بھی ان کا شاگرد رہا ہوں۔ سنو، ان کی پسند کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔"

"ارشاد!" مدھو شعر سننے کے لئے بے قرار تھی۔

نریندر اٹھ کھڑا ہوا اور مدھو کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اسے ایک پیڑ کے قریب ایک خاص پوز میں ساکت رہنے کی ہدایت کر کے یوں سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے اس کی تصویر کھینچے گا۔

مدھو نے شفان کی مہین جاپانی ساری پہن رکھی تھی ساری کا رنگ نیلا تھا اور اس پر ستارے ٹکے ہوئے تھے، اوپر پشمینے کی شال، ہاتھوں میں لال چوڑا اور ساری سے میچ کرتی ہوئی نیلے رنگ کی چوڑیاں تھیں، کانوں میں ٹاپس، گلے میں منگل سوتر اور بالوں کا جوڑا بنا کر اس میں موتیا کے پھول باندھ رکھے تھے، دلہن کی اس پوشاک اور سنگھار میں وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ دیکھتے ہی بنتی تھی۔

نریندر ایک ساتھ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور مدھو کے چہرے پر نگاہیں گڑا کر بولا۔

"لو اب شعر سنو۔"

"ارشاد!" مدھو کے ہونٹ ہلے۔

"کھوئے ہیں جن کی یاد میں وہ روبرو کھڑے
کرتے ہیں خوب ہم یہ نظارا کبھی کبھی!"

نریندر نے شعر پڑھا مدھو کھل اٹھی۔ مہین ساری کے اندر اس کا گورا گدرایا جسم جگ مگ کر رہا تھا۔

"واہ، میں تو تمہیں صرف انجینئر ہی سمجھتی تھی لیکن تم تو بڑے عاشق مزاج نکلے"۔ مدھو نے داد دی اور ساتھ ہی فرمائش کی، "اسی طرح کا ایک اور شعر پلیز"۔

"ڈارلنگ، ایک نہیں دو سنو"۔ نریندر بھی ترنگ میں تھا، اس نے مدھو کی اور دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں شعر پڑھا۔

ہونٹوں پہ آئی بات پی کے مسکرا دیئے
ہوتا ہے اس طرح بھی اشارہ کبھی کبھی"

مدھو کے سرخ نرم ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ نریندر لمحہ بھر رکا اور پھر اگلا شعر پڑھا۔

"آتے ہیں کس ادا سے وہ من کے قریب تر
ہے ان کا روٹھنا بھی گوارا کبھی کبھی"

نریندر شعر پڑھتے پڑھتے آگے بڑھا اور کبھی کبھی کہتے ہوئے مدھو کو اپنے مضبوط بازوؤں میں کس لیا، ننھی حسین چڑیا پھر چہچہائی۔

"پیارے، میں دلہن دراصل آج بنی ہوں۔ آج یہ وشواس ہوا ہے کہ مجھے من کا میت مل گیا"، مدھو نے اٹھلاتے ہوئے حسن و شباب کی نمائش کی۔

"اور مجھے یہ وشواس اسی دن ہو گیا تھا جس دن میں نے تمہارا نام مدھو رکھا تھا" مدھو کہنا چاہتی تھی "میں نے تمہارا نام للو رام رکھا تھا"۔ لیکن وہ ہونٹوں پہ آئی بات پی کے مسکرائی اور ایک قدم آگے بڑھا کر نریندر کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔

نشاط باغ دیکھ کر وہ کتنے خوش تھے جی چاہتا تھا کہ ایک چھوٹا سا بنگلہ دنیا سے نیارا یہیں بن جائے اور دونوں یہیں اسی میں زندگی بسر کر دیں۔

"نور جہاں اور اس کا شوہر جہانگیر بھی یہاں اسی طرح گھومتے رہے ہوں گے" جب وہ ہاتھ میں ہاتھ تھامے رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان گھوم رہے تھے تو مدھو کے من سے سنگیت پھوٹ نکلا۔

"سورگ یعنی جنت جسے کہتے ہیں وہ یہی ہے ہم تم اس وقت جنت میں ہیں"۔ نریندر نے سُر میں سُر ملایا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ "ہم تم جنت میں، ہم تم جنت میں" گن گناتے ہوئے ایک روش سے دوسری روش پر مٹر گشتی کرنے لگے۔

جب وہ لوٹ کر آئے تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ سورج ڈوبنے کا نظارہ انہوں نے ڈونگے پر جھیل ہی میں دیکھا تھا، پہاڑوں پر پھیلی شفق جھیل کے پانی میں منعکس ہو کر اور ہی حسین نظارہ دکھا رہی تھی، دھیرے دھیرے گہناتے ہوئے اندھیرے نے پہاڑوں اور دیودار و چنار کے درختوں اور پورے منظر کو نگل لیا تھا۔ اب آسمان پر تارے اور دھرتی پر بجلی کے قمقمے ٹمٹما رہے تھے، مدھو یعنی دوشیزہ کے ہاتھ میں کنول کے وہ پھول تھے جو انہوں نے ایک دوسرے ڈونگے والے ماجھی سے خریدے تھے۔

بھوک خوب لگ آئی تھی، اس لئے آتے ہی کھانا کھایا جو ہاؤس بوٹ کے مالک غفور کی بیوی رحمت تیار کر دیا کرتی تھی، پتہ چلا کہ کچھ سامان فوراً خریدلانا ضروری ہے ورنہ ناشتہ صبح دیر سے ملے گا۔

"ڈارلنگ چلو تھوڑا گھومنا ہو جائے گا اور سامان بھی خرید لائیں گے۔" نریندر نے مدھو سے کہا۔

"پلیز، تم اکیلے ہی لے آؤ، مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں"، مدھو نے مچل کر جواب دیا اور وہ جھٹ بستر میں دبک گئی۔

نریندر چلا گیا اور مدھو کمبل اوڑھ کر کچھ دیر بے حس و حرکت لیٹی رہی اسے کچھ تکان اور کچھ سردی محسوس ہو رہی تھی، وہ کبھی لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیتی تھی

اور کبھی کھول دیتی تھی، اسے اچانک شوخ مہرالنساء کی یاد آئی اور باغ کا وہ نظارا جب شہزادہ سلیم نے اس سے پوچھا تھا "ایک کبوتر کیا ہوا؟" اور اس نے دوسرا کبوتر پھر سے اڑا کر جواب دیا تھا "یوں اڑ گیا"۔ سلیم مہرالنساء کی اس ادا پر مر مٹا تھا۔

مدھو نے قریب ہی رکھے لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے کنول کے پھول اٹھا لئے جو مور چھل کی طرح ایک ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ مہرالنساء کی شوخی نے اسے گدگدیا تھا اور اس کے اندر چستی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ وہ کنول کے پھولوں سے کبھی دایاں اور کبھی بایاں گال سہلا کر مسکرانے اور اپنے سے کھلواڑ کرنے لگی۔ اچانک اس کا ہاتھ رکا، ہونٹ بھینچے اور دل میں ایک خیال بجلی سا کوند گیا۔ وہ کمبل الگ پھینک کر بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بی بی جی، میں اب چلی جاؤں؟" غفور کی بیوی رحمت نے پوچھا۔

"ہاں جاؤ۔ میں اکیلی مزے میں ہوں، میری کچھ فکر نہ کرو" مدھو نے جواب دیا۔

رحمت اگر نہ بھی پوچھتی تو مدھو خود اسے جانے کی چھٹی دے دیتی کیوں کہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسے تنہائی درکار تھی۔

پاس ہی ایک دوسرا ہاؤس بوٹ تھا جس میں غفور اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ رحمت وہاں اپنے بچوں میں چلی گئی۔

نریندر جب بازار سے لوٹ کر آیا تو ہاؤس بوٹ میں مدھو کے بجائے ایک نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ جو اسے دیکھتے ہی بول اٹھا۔

"ہیلو مسٹر نریندر میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں"

مدھو کو مرد بنا دیکھ کر نریندر حیران و ششدر رہ گیا۔ مدھو نریندر کا کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھی اور ایک سموری ٹوپی اوڑھ کر جیسا کہ ڈاکٹر تیاگ راج پہنتے تھے، بال اس سے اچھی طرح ڈھانپ لئے تھے۔

"یہ کیا سوانگ بھر رکھا ہے؟" نریندر نے مدھو پر ایک نظر سر سے پاؤں تک ڈالی۔

" مسٹر، یہ سوانگ نہیں میرا اصلی روپ ہے اسے سوانگ سمجھ لینے والی تمہاری نظر نے زبردست دھوکا کھایا ہے آج میں پتی اور تم پتنی ہو۔ میرے یہ کپڑے اتار کر تم اپنے وہ کپڑے پہنو، چلو جلدی کرو " مدھو نے اپنے ساری جمپر کی طرف اشارہ کیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" واہ کیا دل لگی ہے ماننا پڑے گا کہ تم جتنی خوب صورت ہو تمہارا تخیل اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے " نریندر اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

" ہاں، میں جتنی خوب صورت ہوں میرا تخیل بھی اتنا ہی خوب صورت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس تخیل کا مزا تبھی آئے گا جب تم میری محبوبہ بن اٹھلاؤ، اتراؤ اور اداؤں سے مجھے گھائل کرو " مدھو نے خود ساری اٹھا کر نریندر کی طرف بڑھادی۔

دوشیزہ کے جس مردانہ بھیس پر نریندر کو تھوڑی دیر پہلے حیرت ہوئی تھی اس تشریح کے بعد اچھا لگ رہا تھا اور اس کے دل کو لبھا رہا تھا جب وہ دل بہلانے اور تفریح کرنے کی غرض سے کشمیر آئے ہیں تو عورت بننے میں کیا برائی ہے وہ ذرا جھجکا اور پھر ساری کا ایک پلو سر پر اوڑھ کر اور گھونگھٹ سا بنا کر اس نے مدھو کی طرف دیکھا اور کمر ذرا لچکائی۔

" اوں ہوں " مدھو نے سر ہلایا۔ " ایسے بات نہیں بنے گی، جس طرح میں نے یہ کپڑے پہن رکھے ہیں تم بھی ساری جمپر پہنو " اور جمپر بھی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ " اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے؟ تم مردوں نے ہم عورتوں کو ہمیشہ کمتر اور حقیر سمجھ کر ہم پر سواری کی ہے کیا ہمیں مرد بن کر تم پر سواری کرنے کا حق نہیں ہے؟ کل میں تمہاری بیوی تھی اور تم میرے شوہر تھے آج کی رات میں تمہارا شوہر ہوں اور تم میری بیوی ہو۔ سمجھے؟ ہمارا یہ نیا زمانہ برابری کا زمانہ ہے اس میں ہر طرح کی دھاندلی ختم ہو کر رہے گی۔ میں تمہارے من کا میت اور تم میرے من کی میت تبھی بن سکتی ہو جب ہم اور تم باری باری مرد اور عورت کا رول ادا کریں۔

تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجے گی"۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک بچّہ تم جنتی ہو تو دوسرا مجھے جننا ہوگا۔"

نریندر نے اس کی بات کاٹی۔ وہ بلاشبہ دل لگی کے موڈ میں تھا لیکن دل لگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، ساری جمپر پہن کر عورت کا رول ادا کرنا ایسی عجیب بات تھی جو اس کی روائتی سمجھ سے باہر تھی۔

"واہ!" مدھو نے طنزاً نریندر کی طرف دیکھا اور سر سے پاؤں تک ایک تیکھی نظر ڈال کر پوچھا، "کیوں حضرت کیا میں اس شخص کو دیکھ رہی ہوں جو کل تک شادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا اور آج اتنی جلدی باپ بننے کے لئے بے قرار ہے۔ سچ کہا ہے بلّی کے خواب میں چھیچھڑے۔ اس مرد نام کے جانور کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے"!

مدھو نے نریندر کی دکھتی رگ پر چوٹ کی تھی اس کا انگ انگ تڑپ اٹھا ہنسی مذاق میں بھی ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اپنے کو ایک طرح کے دھرم سنکٹ میں محسوس کر رہا تھا نہ تو اس سے مدھو کی بات ٹالتے بنتی تھی اور نہ اس میں صاف انکار کی ہمت تھی۔

چالاک دوشیزہ نے اس کی اس کمزوری کو بھانپ لیا اور وہ ایک میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولی "ایک عاشق جہاں گیر تھا جس نے راج پاٹ بھی عشق و محبت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور ایک عاشق تم ہو جو اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ رات کی رات اپنا یہ غرور بھرا مردانہ لباس ترک کر کے عورت کا بھیس اختیار کر لو۔ آنا کانی چھوڑو لو پہنو یہ کپڑے، آزادانہ تفریح، مکمل خوشی تبھی ممکن ہے جب تم خول سے باہر نکلو گے، تنگ نظری کی سطح سے اوپر اٹھو گے"۔

گرم لوہے پر پڑی چوٹ کارگر ثابت ہوئی۔ نریندر نے کسی کٹھ پتلی کی طرح مدھو کے حکم کی تعمیل کی اور منہ سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے مردانہ کپڑے اتار کر اس کی زنانہ پوشاک پہن لی۔

مرد بنی ہوئی دوشیزہ یعنی مدھو نے اپنی سونے کی زنجیر بھی نریندر کے گلے میں پہنا دی۔ ایک ترچھی نظر سر سے پاؤں تک اس پر ڈالی اور ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔ "میری جان، ذرا اوپر دیکھو اور مسکرا کر 'پیا' کہو۔"

"پیا!" نریندر نے جھجکتے شرماتے کہا اور وہ بصد کوشش مسکرایا۔

"اہا میری جان میں تم پر قربان" مدھو نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر ناچنا تھرکنا اور ریڈیو پر کئی مرتبہ سنے ہوئے ایک پنجابی گیت کو تھوڑا بدل کر گانا، شروع کیا:۔

تو بن جا میری ہیر
تجھے لے چلوں کشمیر
تیری سونے کی زنجیر
میرے دل میں تری تصویر
وا وا، کیا کہنے

جب ناچتے گاتے طبیعت خوب بھر گئی اور انگ انگ پر مستی چھا گئی تو اس نے عورت بنے نریندر کو باہوں میں کس لیا اور اپنے گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں پر چسپاں کر دیے۔

---

(۱۲)

"عورت بڑے کانٹے کی ہے۔"

"وہ تو ہے ورنہ تمہیں مرد سے عورت کیوں کر بنا دیتی۔"

"میں عورت کیسے بن گیا یہ تو دو گھڑی کی تفریح تھی۔"

"دلیل اچھی ہے۔"

"دلیل !"

"ہاں، دل کی تسلّی کے لئے انسان دلیل ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔"

"تم بے کار کا بکھیڑا اڈا لتے ہو۔"

"تمہارے رنگ میں بھنگ پڑتا ہے۔ تم تو بکھیڑا کھو گئے ہیں۔ لیکن مجھے ضرورت کیا پڑی ہے بکھیڑا اڈالنے کی۔ تم اپنی تفریح کرو، ساری جمپر پہنو، خوب ناچو کھڑکو۔"

نریندر کی آنکھ صبح سویرے کھل گئی تھی اور وہ اٹھ کر ہاؤس بوٹ کے اندر کھلے میں آ بیٹھا تھا، سامنے کہرے میں لپٹا پہاڑوں کا منظر تھا اور ندی میں ڈونگے چل رہے تھے، لیکن نریندر یہ سب نہیں دیکھ رہا تھا اسے رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا اور جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی عجیب لگ رہا تھا اسے خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی اور دل میں ایک پھانس بھی اٹکی ہوئی تھی، مدھو کب اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اسے یہ پتہ ہی نہیں چلا۔

"مائی ڈیرہ کیا سوچ رہے ہو؟" مدھو نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر میٹھی آواز میں پوچھا۔

نریندر چونکا، چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اصل بات چھپا کر بولا۔

"میں سوچتا ہوں کہ ہم آج ہی یہاں سے پہلگام چل دیں۔"

"لیکن رات تو تم کہہ رہے تھے کہ صبح شنکر آچاریہ کا مندر دیکھنے چلیں گے۔"

"مندر ایک بار تو دیکھ ہی آئے ہیں اب دوبارہ کیا جانا ہے، کبھی پھر دیکھا جائے گا" اس نے ایک نظر مدھو کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی، "پہلگام کشمیر کی حسین ترین جگہ ہے وہاں دور دور سے سیاح آتے ہیں اور وہاں دیکھنے کو بھی بہت کچھ ہے، بہتر ہے کہ آج ہی چل دیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی" مدھو نے پیار کی جس نظر سے دیکھا اس سے رات کے واقعہ کی ساری دھند چھٹ گئی، اب سامنے کا منظر بھی صاف تھا پیڑ پودے اور پہاڑوں کی چوٹیاں نرم نرم کرنوں میں نہا رہی تھیں۔

پہلگام میں خوب چہل پہل تھی، وہاں دلّی اور لکھنؤ ہی سے نہیں، بمبئی، کلکتہ اور مدراس وغیرہ شہروں سے بھی سیّاح آئے ہوئے تھے اور ان میں ایک اچھی خاصی تعداد غیر ملکیوں کی بھی تھی۔ وہاں جتنے لوگ تھے وہ آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے کبوتر کبوتروں میں، ابابیل ابابیلوں میں یا گیہوں گیہوں میں اور چنے چنے میں مل جاتے ہیں، ٹیڑھے میڑھے خطرناک راستوں پر گھوڑے دوڑانے گلیشئر دیکھنے دور تک پیدل نکل جانے، لوٹ کر لدّر کے ٹھنڈے شفاف پانی میں نہانے، ندی کے کنارے بیٹھ کر گفت و شنید کرنے یا آرام کرنے میں وقت یوں گذر جاتا تھا کہ سورج کب نکلا اور کب چھپا، یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

کچھ لوگ گھر کو لوٹ جاتے تھے لیکن اتنے ہی یا اس سے زیادہ ہر روز آجاتے تھے، پہلگام کی چہل پہل جیوں کی تیوں بنی رہتی تھی، اس میں کوئی فرق نہیں آتا تھا نئے آنے والے بھی جلد ہی آپس میں مل جل جاتے تھے، وہاں جو لوگ تھے اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں تھے کیوں کہ انہیں آپس میں ملنے جلنے، بولنے بات چیت کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی ۔۔۔ کے ہنسی مذاق پھولوں اور شہد کی اس دھرتی پر کل کل بہنے

والے ندی نالوں کے پانی کی مانند صاف ستھرے تھے ان میں بغض، کینہ، حسد کی ذرا بھی آلائش نہیں تھی؛ پیڑوں پر چہچہاتے یا نیلے وسیع آسمان میں منڈرانے والے آزاد پرندوں کی مانند قدرت کی اس مخلوق کے دل بھی ریا و مکر سے پاک تھے شاید فطرت کی آغوش میں بیٹھ کر فطرت سے ہمکنار ہو جانے ہی کی غرض سے وہ اتنی دور دور سے وہاں آتے تھے، اگر کسی ایک شخص کی جان پہچان کے کسی دوسرے شخص سے ملاقات ہو جاتی تھی تو وہ دونوں یوں مسرت میں بھر کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے تھے جیسے اس دنیا کے دو فرد آسمانی دنیا میں اچانک ایک دوسرے سے آملے ہوں۔ وہ آپس میں بات چیت کرنے اور بیتی باتیں سننے، سنانے میں غیر معمولی حظ محسوس کرتے تھے۔

نریندر دن میں تین چار مرتبہ لدّر میں نہایا کرتا تھا جہاں دوسرے لوگ کچھ دیر پانی میں ٹھہر کر ٹھنڈک محسوس کرنے لگتے تھے اور پھر باہر نکل کر دھوپ سینکتے تھے نریندر دیر تک پانی میں ڈبکیاں لگاتا، الٹا سیدھا تیرتا یا پھر ساکت لیٹ کر دھارا کے ساتھ بہتا تھا، ایک بار ندی میں گھس جانے کے بعد جی چاہتا تھا کہ گھڑیال کی مانند پانی میں پڑا رہے، ٹھنڈے نرمل جل کے اندر وہ اپنے تن بدن میں ایک ناقابل بیان راحت محسوس کرتا تھا۔

"تم پچھلے جنم میں ضرور کچھوے ہو گے۔"

"اس لئے کہ مجھے پانی میں نہانا بہت پسند ہے۔"

"اور کیا۔ شاید تم اسی لئے پہلگام آنے کی جلدی مچا رہے تھے۔"

"ہاں یہ بھی ایک وجہ تھی۔ میں دو بار پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ ویسے تم نے دیکھا کہ سری نگر کے مقابلے میں یہ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔"

"بلاشک، یہاں سے لوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ایسی بات ہے تو ایک ہفتے کی چھٹی اور بڑھوا لیتے ہیں۔"

"پلیز ڈو۔ آج ہی تار دے دو۔"

نریندر کا اپنا من بھی کچھ روز اور وہاں رہنے کو مچل رہا تھا۔ اس نے تار دے کر مدھو کی خواہش پوری کر دی۔

لیکن آخر یہ ہفتہ بھی ختم ہو گیا اور انہیں اگلے دن وہاں سے چلے جانا تھا، صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا نریندر لدر میں نہا رہا تھا اور مدھو کنارے بیٹھی سورج کی کرنوں اور پہاڑ پر اُگے پیڑ پودوں کو پانی میں منعکس ہوتے دیکھ رہی تھی بہت سے لوگ ادھر اُدھر بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے تھے اور کچھ گھوم پھر رہے تھے اسی کی ہم عمر ایک دوسری لڑکی اس کے قریب آ کر رکی۔ مدھو نے بھی آہٹ پا کر گردن گھمائی اور دونوں کچھ دیر حیرت زدہ سی ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔

" اوہ، مینا ہو "۔

" ریتا ہو۔ "

انہوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور اپنے جدید طریقے سے ایک دوسری کا سواگت کیا، پھر مدھو نے ریتا نام کی اپنی اس سہیلی کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر محتاط کیا، سمجھایا اور اپنے نزدیک بٹھا لیا۔

ریتا کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اس نے اپنی پرانی سہیلی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی، وہ سمجھ گئی کہ اس کی سہیلی اپنے "مینا" نام اور گذشتہ زندگی کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ ورنہ وہ اتنے دنوں بعد ملی تھی اُٹھ کر گلے لگ گئی ہوتی۔

" اخبار میں خبر پڑھ کر ہم تو یہ سمجھے تھے کہ تو دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہے۔" ریتا نے سرگوشی میں بات شروع کی۔ " پر میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں ؟ "

" میری جان۔ میرے جگر کے ٹکڑے تو جو دیکھ رہی ہے وہ سولہ آنے صحیح ہے۔ تو نے جو اخبار میں پڑھا وہ سو فی صد جھوٹ تھا۔" مینا یعنی مدھو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" یہ سب ہوا کیسے ؟ بڑی حیرت کی بات ہے "

" حیرت کی باتیں نہ ہوں تو دنیا کو دنیا کون کہے ؟ " مدھو نے گدگدی سی

محسوس کی اور گھاس کا ایک تنکا توڑ کر پرے پھینک دیا۔

"بڑی اچھی تھی بے چاری میرا نام اوڑھ کر چلتی بنی اور مجھے تمام بندھنوں سے آزاد کر گئی۔"

"سوال یہ ہے کہ اسے یہ نام اوڑھایا کس نے ؟"۔

"میں ہوسٹل سے غائب تھی اور کمپنی میں ڈیوٹی پر بھی نہیں جا رہی تھی ہو سکتا ہے اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی ہو اور پولیس والوں نے یہ نام اسے اوڑھا دیا ہو۔" مدھو نے اندازہ لگایا۔

"شاید یہی بات ہو پر ہم نے سمجھ لیا تھا کہ تو مر گئی۔" ریتا نے کہا اور دونوں سہیلیاں بیک وقت مسکرائیں۔

"کچھ بھی ہو اس بے چاری نے نیا رول ادا کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ اس طرح میں بالکل بے فکر ہو گئی میرا نام اب مینا نہیں مدھو ہے۔" نام بتلاتے ہوئے اس کی آواز اور بھی آہستہ ہو گئی تھی۔

"اچھا مدھو!" ریتا نے سکھی کا نیا نام بڑے دلار سے دہرایا۔ اور تجسس میں بھر کر پوچھا "تو اس وقت تک کہاں تھی اور تیرا یہ نیا رول کیا ہے ؟"

"ادھر اس للّو رام کو دیکھ جو ندی میں مگر مچھ کی طرح نہار رہا ہے۔" ریتا نے، کنکھیوں سے نریندر کو دیکھا اور مدھو نے بات جاری رکھی۔

"اس کے بوڑھے آدمی (ان کی جدید اخلاقیات میں باپ کو باپ کہنا منع تھا، اس کے لئے "بوڑھے آدمی" کہنا ٹھیک تھا) نے مجھے سڑک پر بے ہوش پایا اور اس کے جذبۂ ترحم نے جوش مارا، یہ لوگ مجھے اٹھا کر کوٹھی میں لے گئے، میں نے ہوش میں آ کر یادداشت کھو جانے کا ناٹک کیا۔ اب میں اس للّو رام کی دھرم پتنی ہوں اور اس کے ساتھ ہنی مون منانے یہاں آئی ہوں۔"

مدھو نے "دھرم پتنی" اور "ہنی مون" دونوں الفاظ کی ادائیگی کچھ اس ڈھنگ سے کی کہ دونوں سہیلیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کی ہنسی شاید نریندر

نے بھی سن لی کیوں کہ وہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تیرے اس ہنی مون پر میں تجھے دلی مبارک باد دیتی ہوں" ریتا آنکھوں میں شوخی بھر کر بولی۔

مدھو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور وہ دونوں پھر ہنسیں۔

جب تک نریندر نے ندی سے نکل کر تولیے سے بدن پونچھا اور ذرا سستا کر کپڑے پہنے مدھو نے یادداشت کھو جانے کے ناٹک سے شروع کر کے ہنی مون تک کی اپنی پوری داستان بنا کسی لاگ لپیٹ کے اپنے جدید انداز میں اپنی سہیلی کو کہہ سنائی۔ ریتا سن کر بہت خوش ہوئی۔ مدھو بھی خوش تھی کیوں کہ جس راز کو اس نے اتنے دنوں سے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا اسے اپنی ایک جگری دوست کو بتا کر من ہلکا کیا اور راحت کی سانس لی۔

"تو نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور اپنا رول نہایت کامیابی سے ادا کیا" ریتا نے داد دی اور اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔

نریندر جب کپڑے بدل کر ان کے قریب آیا تو وہ پہلگام کی خوب صورتی اور گلیشیر کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

"میری سکھی ریتا سے ملئے"

ریتا نے ہاتھ آگے بڑھایا جو نریندر نے بغیر تذبذب کے تھام لیا۔

"یہ منسٹری آف انڈسٹری کے چیف سکریٹری کی سٹینو ہیں"

مدھو نے بات جاری رکھی۔ نریندر اور ریتا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مسکرا رہے تھے۔

"آپ ہیں مسٹر نریندر، میرے ۔۔ میرے وہ یعنی ہسبینڈ" مدھو نے نریندر کا تعارف سہیلی سے کرایا۔

نریندر اور ریتا نے ایک دوسرے کا ہاتھ دبا کر اس تعارف پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور پھر ریتا بائی بائی کہہ کر اور مسکراتی ہوئی ان سے رخصت ہوئی۔

نریندر کھویا کھویا سا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی وہ ساکت کھڑا تھا اس کی آنکھیں ایک دم سونی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" مدھو بولی۔

نریندر نے بیوی کی طرف دیکھا اور چند لمحے یونہی دیکھتا رہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اپنی سہیلی سے مل کر تمہیں اپنی پچھلی زندگی کی ساری باتیں یاد آگئیں؟"

"ہاں یاد آگئیں" مدھو نے صاف صاف جواب دیا۔ اس کے لہجے یا اس کے چہرے پر جھجک یا ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"میں کے اینڈ کے کمپنی میں رسیپشنسٹ تھی اور میرا نام مینا تھا"

ایک دولہا دلہن کا ایک نیا جوڑا ان کے قریب سے گذرا، ظاہر ہے کہ وہ بھی ہنی مون منانے آئے تھے بہت خوش تھے اور اپنی کسی بات پر ہنس رہے تھے نریندر اور مدھو دونوں انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگے اور دیکھتے رہے نریندر کا چہرہ سنجیدہ تھا اور مدھو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں طنز تھا۔

"نام کے علاوہ اور کیا تھا؟"

"جو کچھ تھا وہ ایک راز ہے بہتر ہے کہ راز کو راز ہی رہنے دو، اسے کھولنے سے نہ کچھ تمہیں فائدہ ہوگا۔ اور نہ مجھے" مدھو نے پہلے کی طرح مضبوط اور صاف آواز، میں جواب دیا۔

نریندر ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ وہ بہوت رہ گیا لیکن مدھو یعنی مینا کا راز اب اس کا بھی راز تھا اسے راز ہی رکھنا ہوگا، راز فاش کرنے سے مدھو کا شاید کچھ نہ بگڑے لیکن وہ اس کی اور اس کے کنبے کی رسوائی کا باعث یقیناً بن سکتا تھا۔

(۱۳)

کہاوت ہے منہ سے نکلی بات کوٹھے چڑھ جاتی ہے، ریتا ہفتہ ڈیڑھ، ہفتہ کشمیر میں گزار کر دلی لوٹی تو اس کے لئے بات کو پیٹ میں پچائے رکھنا مشکل ہو گیا، آٹھ دس افراد کا ایک گروپ تھا۔ اس گروپ میں ریتا، مینا، آشی دیپا وغیرہ کے علاوہ تین چار نوجوان بھی شامل تھے، ان کی دیوانی جوانی سماج کے بندھنوں سے نفرت کرتی تھی، جیسے باڑھ پر آئی ندی کناروں کو توڑ ڈالتی ہے انہوں نے تمام سماجی اور اخلاقی بندھنوں کو جھٹک کر آزادانہ ڈھنگ سے، زندگی بسر کرنے کا راستہ اپنا لیا تھا جس مینا کو انہوں نے مر گئی سمجھ لیا تھا وہ زندہ ہے اور کتنے ہی لوگوں کو بیوقوف بنا کر اب ایک مہذب خوش حال گھرانے کی بہو بنی ہوئی ہے، اتنی بڑی ڈرامائی واردات کی کم سے کم اپنے گروپ میں چرچا کرنے اور سب کو چونکا دینے کی خوشی سے ریتا اپنے آپ کو کیسے محروم کر لیتی۔

اس نے دلی لوٹتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا اور دوسری طرف کی آواز پہچان کر بولی:

"اوہ آشی ہو!"

"ریتا ہو! کہو کیسی رہی کشمیر کی سیر؟"

"بہت مزیدار۔ تجھے ایک خبر سناتی ہوں، پہلے دل پر ہاتھ رکھ لے"

"کیوں، خیر تو ہے؟"

"بات ویسے خوشی کی ہے"

"خوشی کی ہے تو تو نے مجھے گھبرا کیوں دیا؟۔ سنا، جلدی سنا، چٹ پٹ"

"ہماری وہ مینا تھی نا؟"

"ہاں، تھی۔"

"میری اس سے ملاقات ہوئی۔"

"پگلی کیا تو نیند میں بول رہی ہے؟"

"نہیں میں جاگ رہی ہوں، سن تو سہی"

"........"

"مجھے وہ پہلگام میں ملی۔ وہاں وہ نریندر نام کے اپنے ہسبینڈ کے ساتھ ہنی مون منا رہی تھی"

"عجیب بات ہے۔ وہ تو مر گئی تھی"

"مرنے کی جس خبر پر ہم نے یقین کر لیا تھا وہ اس نے بھی پڑھی تھی اور وہ غلط ہے"

"لاؤ، اس خوشی میں تمہارا منہ چوم لوں" ریسیور پر پچ، کی سی آواز سنائی پڑی، اپنے ہاتھ کی ہتھیلی چوم لینے کے بعد آشی پھر بولی "مینا کا پہلا ہسبینڈ گرمیل بھی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا"

"وہ رشیا سے لوٹ آیا؟"

"ہاں وہ لوٹ آیا۔ مجھے وہ دبنگر میں ملا تھا"

بات چل نکلی۔ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے منہ چڑھ کر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بات ہی ایسی تھی جو بھی سنتا تھا حیران رہ جاتا تھا اور پھر کسی دوسرے کو حیران کر دینے کے لئے بے قرار ہو اٹھتا تھا گروپ میں اور گروپ سے باہر مدھو کے اس نئے رول کی بات مختلف ڈھنگ سے ہونے لگی۔

"کمال ہے، جس مینا کو دنیا نے مرگئی سمجھ لیا تھا وہ ہنی مون مناتی گھوم رہی ہے"

" انسان کرنے پر آئے تو وہ کیا کیا معجزے نہیں کر سکتا !"

" سوچنے کی بات یہ ہے کہ اخبار والوں نے کسی بھی لڑکی کی لاش کو مینا کی لاش کیسے بنا دیا ؟"

" ابے لال بجھکڑ، اسے مینا کی لاش اخبار والوں نے نہیں پولیس نے بنایا "

" پولیس کا اس میں کیا فائدہ تھا ؟ "

" ہو تم بیچ بچ بنئے کی اولاد، ہمیشہ نفع نقصان ہی سوچتے ہو، ورنہ یہ سیدھی سی بات ہے ایرا غیرا نتھو خیرا بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے "

" یونہی تیس مار خاں ہو گئے یا بتاؤ گے بھی کہ سیدھی بات کیسے ہے ؟ "

" سن سیدھی بات یوں ہے، مینا جب چار دن تک لاپتہ رہی تو ہوسٹل والوں کو فکر ہوئی کہ وہ کہیں سڑک کے حادثے میں زخمی نہ ہو گئی ہو، سبھی اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈوں میں فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ایسا کوئی مریض نہیں پہنچا، تب انھوں نے پولیس میں رپٹ لکھوا دی ۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ رپٹ لکھوانے کے دوسرے ہی دن کسی لڑکی کی لاش ملی، اس نے بھی ویسا ہی اسکرٹ ٹاپ اور کنٹھی پہن رکھی تھی جیسی مینا پہنتی تھی ۔ بس اسی بنا پر پولس کے افسروں اور ہوسٹل کے عہدے داروں نے اس لاش کو مینا کی لاش مان کر اور اپنے رجسٹروں میں اسے " مرگئی" لکھ کر اپنے کو کھوج خبر لگانے کی جھنجھٹ سے آزاد کر لیا۔ سمجھا کہ نہیں ؟ "

" اس سے تو ان کی غیر ذمے داری بلکہ یوں کہئے کہ سنگ دلی ظاہر ہوتی ہے "

" اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے عظیم آدرشوں اور اخلاقی قدروں کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے اس مہذب سماج میں انسان کی جو ہے یا مینڈک سے زیادہ اہمیت نہیں ہے "

سامعین مسکرائے ۔ مقرر نے میز پر مکا مارا اور بات جاری رکھی ۔ " اس سے یہ بھی ثابت ہو کہ ... کے خلاف جدوجہد میں انسان اپنی جس کامیابی کی

ڈینگ ہانک رہا ہے، جسے ترقی اور خوش حالی کا نام دے رہا ہے وہ سب فضول ہے۔ زمین کی کشش سے اوپر اٹھ کر خواہ چاند پر پہنچ جاؤ یا اس سے بھی آگے پہنچ جاؤ سماج کی وحشت اور بربریت جیوں کی تیوں بنی رہے گی۔ سماج کے خلاف فرد کی جدوجہد ہی انسانی آزادی کی اصلی لڑائی ہے، جب سماج نہیں تھا تب انسان مکمل انسان تھا، اور جب سماج نہیں رہے گا تب وہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کرے گا۔ ہم اس جدوجہد میں کسی خاص طبقے کی نہیں، ہر اس عام آدمی کی رہنمائی کر رہے ہیں جو اپنی مکمل آزادی کے عہد بربریت کو بھلا بیٹھا ہے، ہم باغی اور انسان دوست ہیں، ترقی اور روشن مستقبل کے سبز باغ دکھانے والے خود غرض اور دھوکے باز ہیں......"

"ہیئر! ہیئر!!"

سامعین نے تالیاں بجائیں۔

"مینا اور اس کے موجودہ رول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" ریتا نے مقرر سے پوچھا۔

"مینا نے سماج کے خلاف فرد کی اس بغاوت کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ مینا زندہ باد!!"

"مینا زندہ باد" گروپ کے تمام ممبروں کا مشترک نعرہ فضا میں گونج اٹھا۔

"صرف زندہ باد سے کام نہیں چلے گا، ہم لوگ ہر طرح سے اس کی مدد کریں گے" مقرر نے اعلان کیا۔

گروپ کے ممبروں نے مینا کے اس رول میں عملی مدد کرنے کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اور اسے پورے سماج کو چونکا دینے والے کلائمیکس تک پہنچا دینے کا منصوبہ تیار کیا۔

اس منصوبے کے مطابق اشی خاص طور پر کرمیل سے جا کر ملی اور اسے بتایا

کہ مینا نام کی تمہاری محبوبہ جس کے تم شوہر ہو مری نہیں، زندہ ہے۔
" زندہ ہے؟" گرمیل کو خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔
" ہاں، اور اس نے نریندر نام کے ایک انجینئر سے دوبارہ بیاہ کر لیا ہے"
" آشی، تم مجھے بناؤ مت، میں کبھی نہیں مان سکتا کہ مینا اگر زندہ ہے تو وہ مجھے دھوکا دے گی۔ کسی دوسرے شخص سے بیاہ رچائے گی"
"تمہیں اگر مجھ پر یقین نہیں تو میں تمہیں خود مینا سے ملوا دیتی ہوں، تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ وہ زندہ ہے، دوبارہ بیاہ کی بات بھی تم خود اسی کے منہ سے سن لینا۔ کیوں، ٹھیک ہے؟"
" ہاں ٹھیک ہے، تم اگر مینا سے میری ملاقات کرا دو تو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا"
گرمیل نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جو آشی نے بلا جھجک تھام لیا اور اس کے چہرے پر نظریں گڑا کر بولی۔ "آج کیا دن ہے۔ سنڈے، تم تھرسڈے کو اسی وقت اسی جگہ ملنا، میں اسے اپنے ساتھ لیتی آؤں گی"
آشی اور گرمیل میں یہ بات چیت پانچ بجے شام انڈیا گیٹ پر ہوئی تھی ویردار کو ٹھیک پانچ بجے شام وہ مینا اور ریتا کو ساتھ لئے وہاں پہنچی، گرمیل پہلے ہی پنت کے بت کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
گرمیل مینا سے اور مینا گرمیل سے مل کر بہت خوش ہوئے، لگتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بے چین تھے، اپنی پریشانی بیان کر دینے کے بعد گرمیل نے پوچھا" یہ دوسرے بیاہ کی بات کیا سچ ہے؟"
" پیارے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے اس کا فیصلہ حالات سے ہوتا ہے ورنہ اس دنیا کا سچ جھوٹ اور جھوٹ سچ ہے" مینا نے دور افق کی جانب دیکھتے ہوئے فلسفیانہ انداز سے جواب دیا۔
"مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ مجھے عجیب و غریب واقعات میں سے گذرنا پڑا۔ میں، ریتا، آشی، تمہارا اور خود اپنا نام تک بھول گئی، بہت سوچنے پر بھی مہینوں کچھ یاد نہیں آیا، یادداشت بالکل کھو گئی تھی۔ اسی حالت میں یہ دوسرا بیاہ ہو گیا۔"

گرمیل نے بیاہ کی بات موت کی خبر کی طرح سنی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ شائد وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ مینا نے جو کچھ بتایا ہے اسے جھوٹ مانے یا سچ۔

"اب؟" اس نے مینا کے چہرے پر نظر گڑا کر پوچھا۔

مینا یکایک سنجیدہ ہو گئی اور سونی آنکھوں سے یوں گرمیل کی طرف دیکھنے لگی جیسے یادداشت ایک بار پھر چلی گئی ہو۔

"اب یہی ہو سکتا ہے" وہ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی۔ "تم عدالت میں جاؤ۔"

"عدالت میں؟" گرمیل نے یوں دہرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ مینا مجھے تم سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔

"ہاں، تم عدالت میں مقدمہ دائر کرو۔" اس نے بغیر کسی گھبراہٹ کے ہموار لہجے میں بات جاری رکھی۔ "پہلے ہسبینڈ کی موجودگی میں دوسری شادی خلاف قانون ہے فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا۔"

درختوں کے سائے دور تک پھیل گئے تھے، گھومنے والوں کی خوب بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ دونوں کھل کر باتیں کر سکیں، ریتا اور آشی ٹہلتی ہوئی دور نکل گئی تھیں،

"کیا عدالت میں جانا ضروری ہے؟" گرمیل نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں۔

"کنواری ہوتی تو تمہارے ساتھ بھاگ سکتی تھی۔" مینا من ہی من کھل کھلا کر ہنسی اور بظاہر بولی۔ "اب تو مجھ پر تمہارا اور رنبیر کا ایک سا حق ہے۔"

"اگر عدالت نے فیصلہ تم پر چھوڑ دیا اور پوچھا کہ تم کس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ عدالت فیصلہ مجھ پر چھوڑ دے گی؟" مینا نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"مان لو کہ وہ چھوڑ دیتی ہے تب تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

"مجھ پر اور اپنے پر بھروسہ رکھو، سوال جب پوچھا جائے گا جواب میں تبھی دوں گی۔"

مینا اس انداز سے مسکرائی کہ گرمیل مطمئن ہو گیا۔

---

(۱۴)

گرمیل نے جب تک مقدمہ دائر کیا تب تک مینا کا ایک اور دعوے دار پیدا ہو گیا۔ وہ بھرے چہرے، گورے چٹے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں والا ایک نوجوان تھا اور اس کا نام انیس احمد تھا، مینا ابھی کالج میں پڑھتی تھی اس کی عمر اٹھارہ انیس برس ہو گی کہ اسے فلمی ہیروئن کی طرح کسی سے پیار کرنے اور پیار رچانے کا شوق چرّایا۔ انیس سامنے کے مکان میں رہتا تھا، وہ خوب صورت چھیلا، جوان تھا، مینا نے اس کی نگاہوں کی گرمی کئی بار اپنے جسم میں محسوس کی تھی، اس نے پگھلی اور پیار بھری نگاہوں کا جواب پیار سے دینا شروع کیا۔ آپس میں پرچے بازی اور پھر ملاقاتیں ہونے لگیں، پیار روز بروز شدت اختیار کرتا گیا، آخر ایک روز بھاگ جانا طے پایا، مینا گھر سے کالج جانے کا بہانہ کر کے آ گئی، انیس احمد پہلے ہی سے اسٹیشن پر موجود تھا، وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر مراد آباد پہنچ گئے۔

مینا لکھنؤ کے مشہور وکیل گھرانے کی لڑکی تھی، "وکیل گھرانہ" نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ ہمارے اس دیس میں جب سے انگریزی کا چلن ہوا تھا اس گھرانے کے سبھی لوگ پشت در پشت انگریزی پڑھ کر وکالت کا دھندا کرتے آ رہے تھے جس میں پیسہ بھی تھا اور عزّت بھی تھی، یہ وہ گھرانہ تھا جس کی دربار داری اور سرکار پرستی کا ذکر کلہن نے راج ترنگنی میں تفصیل سے کیا ہے تعلیم اس گھرانے کے لئے راج دربار تک پہنچنے کی سیڑھی تھی، اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب سنسکرت کا چلن

تھا تو یہ لوگ سنسکرت سیکھتے رہے تھے جب فارسی اور انگریزی راج بھاشا بنی تو انھیں فارسی اور انگریزی سیکھنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوا۔ اس گھرانے کی یہی بڑی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے کو حالات کے مطابق ڈھالتا آیا ہے۔

ملی جلی گنگا جمنی تہذیب جس کا فرنگی نام "کمپوزٹ کلچر" ہے ان لوگوں کی، اسی خصوصیت پر قائم تھی مطلب یہ کہ ان لوگوں نے مغلیہ رہن سہن میں انگریزی طور طریقے ملا کر اسے آسانی سے مغربی روپ دے دیا تھا۔ اپنی اسی خصوصیت اور روائتی حب الوطنی کی وجہ سے اس گھرانے کے وکیل لوگ بہت جلد مجسٹریٹ، جج اور اٹارنی جنرل کے عہدے پا جاتے تھے۔ مینا کا دادا اودھ نارائن دس بارہ برس وکالت کرنے کے بعد اٹارنی جنرل مقرر ہو گیا تھا۔ ایک سیاسی سازش کیس میں اس نے انقلابیوں کو پھانسی اور عمر قید کی سزائیں دلانے میں دلیل بازی اور جادو بیانی کا پرزور مظاہرہ کیا تھا، سرکار کی انہی خدمات کے عوض مینا کا باپ شونارائن ہائی کورٹ کا جج مقرر ہوا تھا۔

شونارائن کے دو لڑکے راج نارائن اور ستیہ نارائن تھے وہ بھی وکیل تھے پیسے کی خوب ریل پیل تھی اور ٹھاٹھ کی رئیسانہ زندگی تھی، لکھنؤ کے رئیسوں میں شعر و شاعری کا شوق نوابی زمانے سے بدستور چلا آ رہا تھا، اس گھرانے میں بھی شعر و شاعری کی محفل اکثر جمتی تھی خود شونارائن نے "خلش" تخلص رکھ چھوڑا تھا، اور آتش، ناسخ اور مصحفی کے گھسے پٹے انداز میں عشقیہ غزلیں لکھا کرتا تھا جنہیں وہ مشاعروں ہی میں نہیں شعر و شاعری کی محفلوں میں اور گھر پر بھی سنایا کرتا تھا جب "واہ واہ" اور "مکرر مکرر" کے شور میں شعر، دوبارہ پڑھنے کی فرمائش ہوتی تھی تو وہ فخر سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ باپ کی، دیکھا دیکھی مینا نے بھی کوتا کرنا اور پریم گیت لکھنا شروع کر دیا تھا اس نے یہ گیت طلباء کی محفلوں میں سنائے اور کالج میگزین میں چھپوائے جس سے اسے اتنی شہرت ملی کہ وہ اپنے کو بہت محسوس کرنے لگی، لیکن پریم گیت لکھتے لکھتے

اس پر پریم دیوانی بننے کی بھی دھن سوار ہوگئی اسی دھن میں وہ انیس کے ساتھ گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی تاکہ رومان کا لطف اٹھا کر رومانی گیتوں کو بامعنی بنایا جائے۔

وکیل گھرانے کی جتنی بڑی عزت تھی لڑکی کا یوں یکایک گھر سے بھاگ جانا اس کے لئے اتنی ہی بڑی رسوائی تھی، اپنی گنگا جمنی کلچر کے باوجود وہ، لوگ بہت پریشان تھے اسی دن سے چوں کہ انیس بھی غائب تھا اس لئے اغوا کی رپٹ تھانے میں لکھوادی۔ ادھر ان کی تلاش شروع ہوئی ادھر انیس نے قاضی کو بلوا کر نکاح پڑھوالیا۔ پندرہ بیس دن مزے سے گذرے، خوب پریم کی پینگیں چڑھیں، لیکن ان کے پاس پیسہ دھیلا جو کچھ تھا وہ اس دوران خرچ ہوگیا۔ اور مرادآباد کے جن یار دوستوں نے پناہ دی تھی انہوں نے بھی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ انیس کو سب سے زیادہ رنج اس بات سے ہوا کہ اس نے جن یار دوستوں پر بھروسہ کیا تھا وہ اس کے دل کی ملکہ مینا کو اس سے ہتھیا لینا چاہتے تھے۔

انیس پریشان ہو اٹھا اور مینا کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے اس کے سامنے تجویز رکھی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ لکھنؤ لوٹ چلیں"

مینا تذبذب میں پڑ گئی، وہاں رہنے اور آگے جانے کا کوئی وسیلہ نہیں، تھا، لیکن وہ لکھنؤ لوٹے تو کس منہ سے لوٹے۔

"کیا ہماری محبت کا یہی انجام ہونا تھا؟"

یہ نہ سوال تھا اور نہ شکایت تھی، یہ مایوسی کی کراہ تھی، دونوں چپ تھے اور انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، کچھ لمحے یونہی گذر گئے۔

"انجام کیوں، اسے آزمائش کہو۔ حسن عشق کی آزمائش نہ ہو وہ عشق ہی کیا ہے"

آخر انیس نے سکوت توڑا اور وہ شہید کے انداز میں مسکرایا۔
وہ دونوں لکھنؤ لوٹ آئے اور اپنے کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا۔ مینا بالغ تھی۔ اس نے عدالت میں بیان دیا کہ انیس نے اس کے ساتھ کسی طرح کی زور زبردستی نہیں کی وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔
عدالت نے انیس کو بری کر دیا اور مینا اپنے گھر چلی آئی۔
طے پایا تھا کہ مینا کچھ عرصہ اپنے گھر پر رہے اس دوران انیس کوئی روزگار کوئی اچھی نوکری تلاش کرے گا۔ جب کوئی سلسلہ بن جائے گا وہ مینا کو اپنے پاس بلالے گا۔
'صبح کا بھولا شام کو گھر آیا' کی کہاوت کے مطابق گھر والے مینا کے لوٹ آنے سے مطمئن تھے اور انہوں نے اس واقعہ کو جوانی کا جنون سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ سال دو سال میں بات آئی گئی ہو جائے گی، اور ذات برادری کا کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس سے مینا کا بیاہ کر دیں گے۔ لیکن وہ لوگ جو دوسروں کے معمولی سے معمولی چھدر ڈھونڈتے رہتے ہیں اتنی بڑی واردات کو کیسے نظر انداز کر دیتے! انھیں تو قسمت سے تفریح اور چرچا کا موضوع ہاتھ لگا تھا۔
"کیا یہ وہی لڑکی ہے جو گھر سے بھاگ گئی تھی؟"
"ہاں، وہی ہے۔ دیکھتی ہو کیسے تھرک رہی ہے اسے حیا لجا تو چھو تک نہیں گئی"۔
"جو حیا لجا والی ہوتی ہیں وہ گھر کی مان مریادا کا دھیان رکھتی ہیں اور ایسی بات سپنے میں بھی نہیں سوچتیں"۔
مینا کسی تہوار، کسی تقریب یا بیاہ شادی میں جاتی تو اس کی طرف انگلیاں اٹھتی تھیں اور اسے اس طرح کا طنز اور تنقید سننی پڑتی تھی ہاپنوں بیگانوں اور سگے سمبندھیوں تک کی باتیں سن سن کر ... اور نفرت کا احساس

ہوتا تھا اور وہ دل ہی دل میں تلملا کر رہ جاتی تھی۔ جب نہ سہا گیا تو اس نے کسی سے ملنا جلنا اور گھر سے باہر جانا ہی بند کر دیا۔ نکاح کی بات صرف اسے معلوم تھی اور وہ انیس کی یادیں دل گذارتی رہی۔ یوں سال سوا سال گذر گیا لیکن اس دوران نہ انیس کا کچھ پتہ چلا اور نہ اس کا خط پتر آیا، اس ماحول میں دم گھٹنے لگا۔ وہ کسے اینڈ کے کمپنی میں ری سپشنلسٹ بن کر دہلی آگئی۔ اور ورکنگ گرلز ہوسٹل میں رہنے لگی۔

تالاب کا مینڈک سمندر میں آ گیا، مینا کی رفتہ رفتہ ان نوجوان لڑکیوں اور ادھیڑ عمر مرد عورتوں سے واقفیت بڑھی جو اس جدیدیت میں جس کی اسے معمولی ہوا لگی تھی بہت آگے نکل چکی تھیں۔ وہ پل میں جینے، چہرے دیکھ کر ہیلو ہیلو کرتے اور ہاتھ ملاتے تھے، جو سامنے نہیں، وہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل اس کی کسی کو فکر نہیں تھی، دہلی کا یہ ماحول مینا کو اس قدر راس آیا کہ اس نے اپنی لکھنؤ کی سکھی سہیلیوں اور گھر کے لوگوں تک کو بہت جلد بھلا دیا، دھیرے دھیرے انیس کا چہرہ بھی فراموشی کے کہرے میں گم ہو گیا۔ لیلا مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، روپ متی باز بہادر وغیرہ کی پریم کہانیوں کی پل میں جینے والی زندگی کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی، ان کی محبت محبت نہیں پاگل پن تھا، محبت کا کسی خاص فرد سے کوئی تعلق نہیں وہ کسی لمحے کسی سے بھی کی جا سکتی ہے، اہمیت ہے تو محبت کے ان لمحات کی جو زندگی کو زندگی بناتے ہیں جن میں انسان داخلی مسرت کی کیفیت میں پہنچ جاتا ہے مینا کو بھی اب صرف مرادآباد میں بتائے گئے دنوں کی یاد آتی تھی جو اس کے انگ انگ میں رومان بھر دیتے تھے یہ نئی کیفیت دل و دماغ پر آخر اتنی چھا گئی کہ اچانک کویتا میں ڈھل گئی:

مجھے وہ سمے یاد آتا ہے
جب میں تم تھی اور تم میں تھے
ہم تم ایک ساتھ سوتے تھے
میرا شریر تمہارے شریر میں،

اور تمہارا اثر پر میرے ہیں
موم کے مانند گھل مل گیا تھا
ہم تم میں کوئی پردا نہیں تھا

پھر سماج دلدمنا بیچ میں آئی
پرچھائیاں لمبی ہوتی چلی گئیں
اندھیرا گہراتا چلا گیا
اب تم کہیں ہو، میں کہیں
تم مجھے اور میں تمہیں بھول گئی
پر وہ دن رہ رہ کر یاد آتے ہیں
اور یاد کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا
یاد ـــــ پیاری یاد!

کویتا اس نے ایک ادبی مجلس میں سنائی وہیں اس کی گرمیل سے ملاقات ہوئی، وہاں جو کوی اور لیکھک اکٹھے ہوئے تھے ان میں کچھ جدیدیت پسند، کچھ ترقی پسند اور کچھ اپنے کو جدیدیت پسند اور ترقی پسند دونوں مانتے تھے، دراصل جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان کی امتیازی لکیر نہایت مہین تھی آج کے جدیدیت پسند کو کل ترقی پسند اور آج کے ترقی پسند کو کل جدیدیت پسند بن جانے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ دراصل اپنے کو جدیدیت پسند اور ترقی پسند ایک ساتھ کہلانے والا ہمیشہ فائدے میں رہتا تھا۔ اور ایسے ہی قلم کاروں کی تعداد زیادہ تھی، گرمیل "آبھا" نام کا ایک ماہواری رسالہ نکالتا تھا اور اس میں ان تینوں قسم کے شاعروں اور ادیبوں کی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ ایک ایڈیٹر شاعر اور نقاد کی حیثیت سے گرمیل کو ان سب میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور اس ادبی مجلس کا کرتا دھرتا وہی تھا۔ مینا کو دیکھ کر سب

کے چہرے کھل اٹھے اور گرمیل سمیت سبھی نے اس کی کویتا کی خوب تعریف کی۔
"کیا مجھے آپ کی یہ سندر کویتا اپنے پرچے میں چھاپنے کا فخر حاصل ہو سکتا ہے ؟" میٹنگ کے بعد کافی پیتے ہوئے گرمیل نے مینا سے کہا۔
"نیکی اور پوچھ پوچھ !" مینا نے چہچہاتے ہوئے جواب دیا، "آپ کے پرچے میں چھپنا میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔"
'آبھا' کے اگلے شمارے میں مینا کی صرف ہی کویتا نہیں ایک ساتھ پانچ کویتائیں چھپیں بعد کے پانچ شماروں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، چھٹے شمارے کے پہلے صفحے پر مینا کی تصویر اور اندر "آدھینک کویتا کی مولک پرتبھا" عنوان سے مضمون چھپا، ہندی کے پروفیسر ڈاکٹر ہرش ناتھ سسودیا نے اپنے اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مینا نے نئے اسلوب اور نادر علامتوں سے جدید شاعری کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جدید تنقید کی ساری لفاظی صرف کر دی تھی۔
گرمیل اور مینا میں ادبی مجلس کے باہر بھی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں، رفتہ رفتہ قربت یہاں تک بڑھی کہ وہ تو میں اور میں تو ہو جانے کے آخری نکتے تک پہنچ گئے۔ ایک بار مینا اور گرمیل گوردوارہ صاحب دیکھنے امرتسر گئے، اور وہیں انہوں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔
گورا جسم، بڑی بڑی آنکھیں اور چوڑی پیشانی، گرمیل ایس سے کسی طرح کم خوب صورت نہیں تھا، اس کا جنم پنجاب کے ایک خوش حال گھرانے میں ہوا تھا لیکن جوانی میں قدم رکھتے ہی اس نے کیس منڈوا دیے تھے اور کچھ کڑا وغیرہ دھرم کی تمام علامتوں کو خیرباد کہہ کر گھر والوں سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اب وہ جدیدیت، ترقی پسندی اور سیکولرزم کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ شاہ خرچ آدمی تھا۔ پرچے کی آمدنی اور مینا کی تنخواہ سے بھی کام نہیں چلتا تھا اس لئے ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا۔ پتہ چلا کہ روس نے بھارت سرکار سے مختلف زبانوں کے مترجم مانگے ہیں جنہیں چار سال معاہدے پر ماسکو جانا ہوگا۔ گرمیل

انگریزی سے ہندی اور پنجابی دونوں میں بخوبی ترجمہ کرلیتا تھا اچھی تنخواہ بدیس گھومنے اور آگے بڑھنے کا سنہری موقع، وہ جوڑ توڑ کرکے مترجم کی حیثیت سے روس پہنچ جانے میں کامیاب ہوگیا۔

مینا پھر ورکنگ گرلز ہوسٹل میں رہنے لگی۔ اب کے اسے اشی اور ریتا کی صحبت ملی۔ اس نے شریمتی ہیلن بی اینڈ ملن اور مار بل مارگن کی لکھی ہوئی "آکرشک ناری" اور "سمپورن ناری" کتابیں پڑھیں جن میں مردوں کو لبھانے اور بس میں کرنے کے طریقے بتائے گئے تھے، دونوں عورتوں نے امریکہ میں اسی نام کی تحریکیں بھی چلا رکھی تھیں اور یہ کتابیں انہوں نے ان تحریکوں میں اپنے تجربے کی بنا پر لکھی تھیں۔ جو لاکھوں کی تعداد میں بکی تھیں، ان کتابوں نے مینا کو یہاں تک متاثر کیا کہ وہ آزاد جنسی ارتباط کے حمائتی آشی اور ریتا کے گروپ کی ممبر بن گئی۔

مینا کی ذہنی تربیت اس میں کسی طرح مانع نہیں تھی، دوسرا سبب، گرمیل کے بارے میں ملی یہ اطلاع ہوسکتی تھی کہ اس نے وہاں کسی روسی خاتون سے شادی کرلی ہے، جس شخص نے مینا سے وفاداری نہیں نبھائی، مینا بھی کیوں اس کی وفادار بنی رہے؟

گرمیل جب لوٹ کر اپنے وطن آیا تو دوستوں نے پہلا سوال یہی پوچھا کہ کیا اس نے وہاں سچ مچ شادی کرلی تھی؟

"ہاں، کرلی تھی۔ لیکن وہ شادی صرف وہیں کے لئے تھی نہ کہ یہاں کے لئے"، گرمیل نے بغیر جھینپے سیدھے سبھاؤ۔ جواب دیا تھا۔

مینا نے جس طرح پہلے انیس کو بھلا دیا تھا گرمیل کو بھی بھلا دیا۔ لیکن اب وہ دونوں اس کے دعوے دار بن گئے، دونوں اسے پانے کے لئے بے قرار ہوا ٹھے اور دونوں نے نریندر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

مینا خوش تھی کہ تین تین مرد اس کے لئے ایک دوسرے کے رقیب بن گئے ہیں

تینوں اسے اپنی محبوبہ ، اپنی بیوی سمجھتے ہیں ۔ جب کہ وہ نہ کسی کی بیوی اور نہ کسی کی محبوبہ ہے ۔ جب مقدمہ دائر ہوا تو اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بصد فخر کہا:

"میں ہر بندھن ، ہر قید سے آزاد سمپورن ناری ہوں ۔ مجھے مردوں کو لبھانے اور انھیں بس میں کرنے کی کلا آتی ہے۔"

---

(۱۵)

لوگ عدالتوں سے انصاف کی امید کرتے ہیں، لیکن ہوتا ہے کہ وہاں عوام پر سے جتنی اون اتر سکے اتاری جاتی ہے۔ برٹش سرکار کی بنیاد ہی تھانے اور کچہری کا خوف تھا، حکومت کا وہی طریقہ اب بھی جاری ہے۔ ہمارے اس دیس میں انصاف جتنا مہنگا ہے دنیا کے شائد اور کسی ملک میں نہیں، پیادے کو خوش کئے بغیر سمن کی تعمیل ممکن نہیں، وہ گھر پر بیٹھے بیٹھے لکھ دے گا میں گیا لیکن ملزم نہیں ملا، پیشکار اس مندر کا ایسا دیوتا ہے اس کی پوجا ہو جائے تو جتنی لمبی پیشی چاہو وہ ڈال دے گا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ مہاشے تم نے ایسا کیوں کیا؟ نتیجہ یہ کہ معمولی سے معمولی مقدمہ برسوں گھسٹتا رہتا ہے، جو شخص قتل جیسے سنگین جرم میں گرفتار ہو جاتا ہے، بغیر جرم کئے ہی برسوں جیل میں سڑتا رہتا ہے۔ ۱۰۹ سی۔ آر پی، سی، کی ایسی دفعہ ہے جس کے تحت کسی بھی آدمی کو گرفتار کیا جا سکتا ہے، اسے مجرم ثابت کرنے کی ذمے داری پولس پر نہیں بلکہ خود اسے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ پڑے رہو جیل میں، اگر پردیسی ہے تو بے چارہ ضمانت تک مہیا نہیں کر سکتا۔

مینا کا مقدمہ ہی نرالا تھا اس میں گرمیل، انیس اور نریندر ـــ تینوں کو اپنے اپنے گواہ اور اپنے اپنے ثبوت پیش کرنے تھے۔ انہیں گواہ اور ثبوت فراہم کرنے کے لئے کتنا وقت چاہئے! اس کے علاوہ گواہوں کو

عدالت میں لاتا اور بھی ٹیڑھی کھیر تھی اس لئے مقدمے کے لمبا کھنچ جانے کے، امکانات اور بھی زیادہ تھے۔ نرالا ہونے کے باعث مقدمے میں لوگوں کی دلچسپی بھی زیادہ تھی، عدالت کا کمرہ ہر مرتبہ مینا کو دیکھنے والوں سے کھچا کھچ بھر جاتا تھا اور اخبار کے نامہ نگاروں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ مینا کی کئی طرح کی تصویریں شائع ہوئیں جن کے نیچے "تین تین شادیاں بیک وقت کرنے والی حسینہ" لکھا رہتا تھا۔ اور ان شادیوں کی کہانی اس قدر دلچسپ بنا کر لکھی گئی تھی کہ، جاسوسی ناولوں کو مات کر دیا تھا۔ منچلے نوجوان اس عجیب وغریب حسینہ کو ایک نظر دیکھ لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے اور پھر آپس میں باتیں کرتے تھے۔

"یار چیز واقعی لاجواب ہے"

"کیا تمہارا بھی دل آگیا ہے اس پر؟"

"میری بات چھوڑو تم اپنے دل کی بات کہو"

یہ لوگ دل پھینک قسم کے تھے جن کا سماجی شعور صفر کے برابر تھا اور بھیڑ میں انہی کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن تعداد خواہ کم ہی سہی، حاضرین میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس واقعہ کو سماجی اور قومی پس منظر میں دیکھتے جانچتے تھے، اس قسم کے لوگوں کو نکتہ داں بھی کہا جا سکتا ہے، ان کی بات چیت کا لہجہ اور معیار پہلی قسم کے لوگوں سے بہت مختلف تھا۔

"میری رائے میں اس حسینہ کو پدم شری یا پدم بھوشن ملنا چاہئے"

"کیوں بھئی، وہ کس خوشی میں؟"

"واہ جس سیکولرزم کا اتنا راگ الاپا جا رہا ہے، یہ حسینہ اس کا زندہ مجسمہ ہے"

"اور کمپوزٹ کلچر کی جسے گنگا جمنی تہذیب بھی کہتے ہیں، یہ چلتی پھرتی مثال ہے"

"اگر اس کا ایک پارسی اور عیسائی خاوند بھی ہوتا تو بے مثال ایک دم صحیح

اور مکمل ہوتی ۔ اور حسینہ کو پانچ پانڈو کی بیوی کہلانے کا فخر حاصل ہوتا، ممکن ہے 'جدید دروپدی' نام سے اس پر فلم بھی بن جاتی "

"کون جانے پارسی اور عیسائی خاوند بھی ہوں لیکن انھوں نے عدالت میں آنا ضروری نہ سمجھا ہو"

"یہ بھی آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں شائد ان کے پاس گواہ اور ثبوت نہیں ہوں گے "

"آپ کیا بات کرتے ہیں! بغیر گواہ اور ثبوت کے تو دو ہی کیوں بہت سے ہوں گے "

اس پر قہقہے غبّاروں کی طرح اچھلتے۔

" کیا کہا؟ کیا کہا؟ ذرا ایک بار پھر بتانا " کتنوں ہی کے کان کھڑے ہو جاتے۔

مینا کا باپ مر چکا تھا۔ اس کے بھائی ستیہ نارائن اور راج نارائن نے اس مقدمے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، مینا کے مرنے کی جو خبر اخبار میں نکل چکی تھی ان کے لئے وہ اب بھی صحیح تھی۔ غلط سمجھ لینے میں ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مینا جو اُن کی بہن تھی وہ دراصل اس خبر کے چھپنے سے پہلے ہی مر چکی تھی، تین شوہروں والی اس مینا سے جس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا جس میں منچلے نوجوانوں اور اخباروں کی اتنی دل چسپی تھی ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا، بھائی جسے بدنامی سمجھ کر چپ تھے مینا کے لئے وہ اس کے نئے رول کا نکتہ عروج تھا۔ اخباروں میں اس کی تصویریں اور نام جتنا چھپتا تھا وہ اتنا ہی خوش ہوتی تھی ایک بار "دھرم یگ" اور "السٹریٹڈ ویکلی" کے آخری صفحہ پر اس نے کالج کی اپنی ایک سہیلی اننتا کی تصویر دیکھی تھی دراصل وہ ساریوں کا اشتہار تھا جس میں اننتا "رودبیا" کی ساری پہنے ماڈل بنی کھڑی تھی، اس وقت مینا کے دل میں سہیلی کی یہ تصویر دیکھ کر حسد پیدا ہوا تھا لیکن اب اگر اتفاق سے اننتا

اسے کہیں مل جائے تو وہ اس سے فخریہ کہے "اشتہار میں ماڈل بن کر چھپ جانا بھی کوئی بہادری ہے" دیکھ پبلسٹی لینا اسے کہتے ہیں"

سانپ کے منہ میں چھچھوندر کھائے تو کوڑھی اور چھوڑے تو کلنکی، دکھی اگر کوئی تھا تو وہ نریندر اور اس سے بھی کہیں زیادہ اس کے بوڑھے ماں باپ تھے۔ نریندر کو پہلگام ہی میں یقین ہو گیا تھا کہ مدھو یعنی دوشیزہ نے یادداشت جاتے رہنے کا محض بہانہ کیا تھا ورنہ اسے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ یاد تھا کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔ نہ یاد ہوتا تو وہ گلدستے کے پانی میں چینی کیسے گھول دیتی، پھر بھی وہ راز کو راز بنائے رکھنا اور میاں بیوی کے مقدس رشتے کو آخر تک نبا ہنا چاہتا تھا تاکہ ماں باپ ذہنی اذیت سے بچے رہیں، ان کا بڑھاپا خراب نہ ہو۔ تاکہ اس کے خاندان کی جگ ہنسائی اور رسوائی نہ ہو۔

لیکن جس راز کو نریندر نے چھپایا مدھو کی سہیلی ریتا نے اسے راز نہیں رہنے دیا، کشمیر سے لوٹتے ہی اسے فاش کر دیا۔ جب عدالت کے سمن آئے تو نریندر کے پاؤں تلے دھرتی گھوم گئی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"نریندر کیا ہوا؟" ڈاکٹر تیاگ راج نے تشویش کا اظہار کیا۔

"پتاجی کیا بتاؤں ستیاناس"۔ اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

"ستیاناس کیسا؟" کچھ بتاؤ تو سہی، بات کیا ہے؟"

ان دونوں کو گھبرائے ہوئے دیکھ کر سبھدرا ڈرائنگ روم میں آئی اور بیٹے کو سر پکڑے بیٹھے دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی۔

"یہ مدھو نام کی لڑکی یہاں آنے سے پہلے دو بیاہ کر چکی تھی" نریندر نے جواب دیا۔

"دو بیاہ؟" سبھدرا اور تیاگ راج دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں، اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے، یادداشت کھو جانا محض ایک بہانہ تھا"

دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ نہیں لگا کہ ان کی عمر بھر کی کمائی دھول میں مل

گئی ہے، ایسی بہو سے تو نریندر کا زندگی بھر کنوارا رہنا کہیں اچھا تھا۔ دنیا سنے گی تو کیا کہے گی؟"

"کچھ دیر سناٹا رہا۔

"میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے جو میں اس مصیبت کو اٹھا کر گھر لایا، وہیں سڑک پر پڑی رہنے دیتا" ڈاکٹر تیاگی آج پچھتائے۔ ان کی آنکھیں چڑھ گئیں اور گھٹنے تیز تیز ہلنے لگے۔

"پرانے لوگ رشتہ ناطہ کرنے سے پہلے خاندان عزت اور شرافت کی جانچ پڑتال یوں ہی تو نہیں کرتے تھے، ہم نے نہ کچھ دیکھا، نہ سمجھا، اندھیرے میں چھلانگ لگا دی" سبھدرا ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

نریندر چپ تھا۔ اور وہ دانتوں سے بائیں ہاتھ کی انگلی کا ناخن کاٹ رہا تھا۔

"کیوں بیٹی، تم نے یہ کس جنم کا بدلہ ہم سے لیا؟" سبھدرا نے مدھو یعنی مینا سے اس کے کمرے میں جا کر پوچھا۔

وہ پلنگ پر چت لیٹی اوپر چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سبھدرا کو دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ماں جی یہ سب جھوٹ ہے، وہ لوگ چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں میں انھیں جانتی تک نہیں، بلیک میلنگ کر کے وہ آپ لوگوں سے روپیہ اینٹھنا چاہتے ہیں" مدھو نے ملائمت سے سر جھکا کر صفائی پیش کی۔

"تم نے بیاہ نہیں کیا؟" سبھدرا نے پوچھا۔

"نہیں کیا، نہیں کیا، میں عدالت میں سب کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دوں گی اور انہیں سزا دلواؤں گی۔ انہوں نے سمجھا کیا ہے"

نریندر بھی سبھدرا کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اندر دروازے میں کھڑا کھڑا، اس کا ناٹک دیکھ سن رہا تھا۔

"بیاہ کیا یا نہیں کیا اس بات پر مٹی ڈالو"۔ نریندر ایک قدم آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوا۔ "لیکن کیا ہم یقین کر لیں کہ تم عدالت میں ٹھیک یہی بیان دو گی؟"

مدھو یعنی دوشیزہ نے انہیں یقین دلایا کہ یہ بیان بالکل صحیح ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا بیان ہو ہی نہیں سکتا۔

فوجداری کے مقدموں میں حاضر جوابی وکیل کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پریم ناتھ چگ کو یہ وصف اپنے والد دینا ناتھ چگ سے وراثت میں ملا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ فوجداری میں اس کی ٹکر کا کوئی دوسرا وکیل نہیں ہے۔ عدالت میں کھڑے ہو کر عورت کو مرد اور مرد کو عورت ثابت کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، فریق ثانی کا وکیل، مجسٹریٹ اور جج اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ سب کے منہ میں گھنگھنیاں پڑ جاتی ہیں۔

نریندر نے باپ سے مشورہ کر کے چگ کو اپنا وکیل بنایا۔ اور اس امید میں کہ مدھو کا چال چلن چاہے کچھ بھی رہا ہو، اگر وہ مقدمہ جیت لیتے ہیں تو کم سے کم دنیاوی طور پر تو عزت و ناموس پر آنچ نہیں آئے گی۔ اس کی اونچی سے اونچی فیس ادا کر دی۔

(۱۶)

وقت اپنی چال چلتا رہتا ہے، اس چال سے نئی صورتِ حال پیدا ہوتی رہتی ہے، فرد ہو یا قوم جو اس نئی صورتِ حال کو سمجھ نہیں پاتا، یا پھر کسی لوبھ لالچ کے سبب اپنے کو نئی صورتِ حال کے مطابق ڈھال نہیں پاتا وہ جانے انجانے ایسی غلطیاں کرتا ہے جن کے نتیجے نہایت خطرناک ہوتے ہیں، اپنی بھول محسوس، ہو جانے کے بعد ایک ایماندار آدمی کے لئے "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"، کہاوت کے مطابق سر دھن لینے کے علاوہ اور کچھ چارہ نہیں رہ جاتا کیوں کہ تب تک ڈھیروں پانی پل کے نیچے سے گذر چکا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گجندر سین کی بھی ٹھیک یہی حالت تھی اور وہ اس وقت کو پچھتا رہا تھا جب اس نے نریندر کو مدھو سے بیاہ کر لینے کا مشورہ دیا تھا

یہ بھید کھل جانے سے کہ مدھو نے یادداشت کھو جانے کا ناٹک رچا تھا اسے بے حد صدمہ ہوا تھا، وہ سبھدرا اور تیاگ راج سے بھی زیادہ دکھی تھا، رنج نے اسے بدحواس کر دیا تھا کسی مریض کو غلط دوا نہ دے دی جائے اس ڈر سے وہ دو تین دن اپنے کلنک بھی نہیں گیا۔ حواس جب کچھ ٹھکانے آئے تب بھی کلنک جانے کے بجائے پہلے ڈاکٹر تیاگ راج کے گھر گیا اور جاتے ہی بولا:

"نریندر بھیا! آپ لوگوں پر جو بجلی گری ہے اس کے لئے ذمے دار میں ہوں۔

تم نے لڑکی کو اس کے پہناوے سے ٹھیک پہچان لیا تھا اور تم نے اس کے مینڈرکس کھا کر بے ہوش ہو جانے کی بات بھی ٹھیک ہی سوچی تھی پر مجھے عقل نہیں آئی، میں نے ہی تمہارے پاؤں نہیں لگنے دیئے، نئی نسل کے بارے میں میرے لبرل رویّے نے میری نظر کو دھندلا دیا تھا۔ میں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ جدیدیت کا جنون شہد کو بھی زہریلا بنا دیتا ہے۔"

"بیٹا، تم کیوں فضول دکھی ہوتے ہو" سبھدرا نے اسے تسلّی دی۔ "جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ میری طرف دیکھو ساری عمر لڑکیوں کو پڑھایا، بال سفید ہو گئے، پر میں اسے اتنے دن پاس رکھ کر بھی نہ سمجھ سکی، نریندر کا بیاہ ہو جائے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچا۔"

"لیکن میں تو سب کچھ سوچتے سمجھتے ہوئے بیوقوف بنا، نریندر کے جیتانے پر نہیں چیتا، میری اس بھول سے آپ لوگوں کو اتنی بڑی مصیبت اٹھانی پڑی۔"

"ڈاکٹر، جذباتیت چھوڑو۔" تیاگ راج کی مضبوط آواز سنائی پڑی "نریندر کے بیاہ سے ہم بھی خوش تھے اور تم بھی خوش تھے، قصوروار ہیں تو ہم سب ہیں ورنہ کوئی نہیں۔ تم بہکی بہکی باتیں چھوڑو اور اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ جو سر پر آ پڑی ہے اسے سب مل جل بھگتیں گے، تم کیوں دل تھوڑا کرتے ہو۔"

جب کوئی نیند سے جاگے اور "آگ لگ گئی" سن کر پہلے کچھ گھبرائے اور پھر اسے مستعدی سے بجھانے میں لگ جائے ویسے ہی ڈاکٹر تیاگ راج ایک جھٹکا کھانے کے بعد سنبھل گئے تھے اب نہ ان کے گھٹنے ہلتے تھے اور نہ آواز کانپتی ہے وہ صوفے پر سیدھے بیٹھے تھے اور چہرے پر سکون اور سنجیدگی تھی ان کا دھیرج دیکھ کر سبھدرا اور نریندر کی بھی ڈھارس بندھی اور انہوں نے سر پٹخی بھگت کی لیٹ کر کسل لی تھی

بھدرسین نے تیاگ راج کا متین اور سنجیدہ چہرہ دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک کے بعد ایک تاریخ کے کئی صفحے پلٹ گئے۔

تیاگ راج کے پتا شونا تھ اور اس کے اپنے دادا گیا پرساد جگری دوست تھے اور انیسویں صدی کے آخری دہا کے اور بیسویں صدی کے شروع کے دو دہائیوں کی سیاست میں سرگرم حصہ لینے والے قوم پرست تھے انہوں نے گیتا سے متاثر ہو کر کرم جوگی بننے کا عہد لیا تھا وہ عوام کو بیدار کرنے میں اور ان میں حب الوطنی کی روح پھونکنے کے لئے "نقارہ" نام کا ہفتے وار اخبار نکالتے اور پمفلٹ چھاپتے تھے، وہ بال گنگا دھر تلک کے نظریے سے متفق تھے کہ اصلاحات کی مانگ سماج کے اندر سے آنی چاہئے، وہ تلک ہی کی طرح اپنے کو انگریز کے آگے صاحب بنا کر پیش کرنے والے نام نہاد مصلحین کے سخت مخالف تھے دلیل یہ تھی کہ غیر ملکی سرکار کی مدد سے تھوپی گئی اصلاحات سے کوئی فائدہ ہونے کے بجائے عوام میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور انگریز حکمرانوں کو یہ پرچار کرنے کا موقع ملتا ہے کہ وہ ہم جاہلوں کو مہذب بنا رہے ہیں۔ ان کا یہاں آنا خدائی برکت ہے۔

شونا تھ اور گیا پرساد میں دانت کاٹی روٹی تھی، ان دونوں گھرانوں میں تبھی سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ تیاگ راج شونا تھ کا اکلوتا بیٹا تھا اس نے اقتصادیات میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی اور وہ تعلیم کے شعبے میں چلا گیا۔ شونا تھ اور گیا پرساد نے پمفلٹ چھاپنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس نے ان کی زندگی میں ہی "نیشنل پبلشنگ ہاؤس" کی شکل اختیار کر لی تھی بھدرسین کے باپ گنپت رائے نے یہ پبلشنگ ہاؤس سنبھالا اور وہ نیشنلسٹ لٹریچر چھاپتے رہے، ۱۹۲۱ء کے ستیاگرہ میں وہ جیل گئے اور ان کی دو کتابیں "برٹش راج۔ ایک سازش" اور جلیانوالا باغ کی خونی ہولی سے متعلق ایک ناٹک "زنجیریں ٹوٹیں" برطانوی حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔

باپ کے بعد "نیشنل پبلشنگ ہاؤس" کو بھدر سین کے بڑے بھائی اندر سین نے سنبھالا۔ وہ جیل ہی میں دہشت پسند سے مارکس وادی بن گیا تھا اس نے ترقی پسند اور مارکس وادوہ لٹریچر شائع کیا جس کا مقصد ترقی پسندی کی لڑائی کو صحیح سمت عطا کرنا تھا، پچھلے دنوں جب ان کا انتقال ہوا تو جمنا کنارے نگم بودھ کے شمشان گھاٹ میں اس کے واہ سنسکار کے وقت سگے سمبندھیوں اور پرانے انقلابیوں کے علاوہ کانگرسی لیڈر بھی اظہار عقیدت کرنے آئے تھے۔

ڈاکٹری تعلیم کے علاوہ بھدر سین کو دادا اور باپ سے قومی اور بھائی سے بائیں روایت وراثت میں ملی تھی، دونوں طرح کے لٹریچر کا بخوبی مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ علم پشت در پشت آگے بڑھتا ہے نئی نسل کے متعلق اس کا رویہ بھی اسی لئے لبرل تھا۔

مدھو یعنی مینا کے اس واقعہ نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا۔ جب اس کا ذہنی رشتہ فکر کی صحت مند روایت سے تھا اس نے نریندر کو غلط مشورہ کیوں دیا؟ کیوں اس نے اپنے ایک عزیز گھرانے کو مصیبت میں ڈھکیلا؟ قوم کا شعور بلند کرنے اور اسے صحیح سمت عطا کرنے کی جو کوشش لگ بھگ ایک صدی پہلے سے شروع ہوئی تھی اس کا کیا بنا؟ اصلاح اور انقلاب کے سپنے دھرے کیوں رہ گئے؟ روز بروز بڑھ رہے جرائم کے لئے اپنے کو تعلیم یافتہ کہلانے والے سب سے زیادہ قصور وار ہیں، خود اس نے ایک سماج دشمن رجحان کو بڑھاوا دینے کا حقارت انگیز گناہ کیا ہے۔ آخر یہ سب ہوا کیوں؟ وہ، نریندر، سبھدرا اور تیاگ راج۔ سب کے سب اس جال میں مچھلیوں کی طرح آسانی سے کیوں پھنس گئے؟

بھدر سین کو یہ دوسرا صدمہ پہنچا تھا جس نے اس کے عقیدے کو جڑ سے ہلا دیا تھا۔ پہلا صدمہ تب پہنچا تھا جب بایاں بازو ٹکڑوں میں بٹا تھا۔ تب اس نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے سہگل سے پوچھا تھا "اس کا

سبب یہ تو نہیں کہ ملک ٹھہراؤ اور جمود کی حالت میں پہنچ گیا ہے؟"

"ڈاکٹر، تم بے کار سوچتے ہو" سہگل نے جواب دیا تھا۔

"میں سوچتا تو ہوں" زہر میں بجھی ایک طنزیہ مسکراہٹ بھدر سین کے ہونٹوں پر اتر آئی تھی اور اس نے سہگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "یہ بھی دیکھ ہے کہ تم ——— تم جو دانشور ہو ——— سوچتے نہیں"

ہگتے باز محمد علی اور پروفیسر سومناتھ سہگل کی شکل بھدر سین کے ذہن میں بیک وقت ابھر آئی۔

"جو سر پہ آ پڑی ہے اسے سب مل جل کر بھگتیں گے"

شکل دھندلا گئی۔ بھدر سین نے گردن اٹھا کر تیاگ راج کی طرف دیکھا۔ اسے وہ انسانی استقلال اور مصیبتوں کو دھتکارنے والی جرأت کے مجسمے معلوم ہوئے اور اب اس کا ذہن صاف اور دل تندرست تھا۔ وہ اٹھا اور جا کر کلنک کھولا، ہمیشہ کی طرح مریضوں کو دیکھا اور دوا دی۔

نریندر کا مقدمہ اس کے لئے مقدمہ نہیں، ایک سنجیدہ مسئلہ تھا۔ جسے وہ دل و دماغ کی پوری قوت صرف کر کے سلجھانا چاہتا تھا۔ وہ ہر پیشی پر عدالت میں جاتا تھا اور تمام کاروائی غور سے سنتا تھا۔ جوں جوں مقدمہ لمبا، کھنچا اور مدھولیفی، مینا، گرمیل وانیس کے بیان سنے اور جرح سنی توں توں "جدیدیت" اور "ترقی پسندی" کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے چلے گئے، نہ صرف یہ کہ نریندر کو دی گئی صلاح کو اس نے نظریاتی اعتبار سے سمجھا بلکہ ہمارے بائیں بازو اور قومی زندگی کے جن تضادوں کو پہلے صدمے میں نہیں سمجھ پایا تھا وہ اب واضح ہو گئے۔

"تم نے ایک شریف پریوار کو دھوکا کیوں دیا؟" مجسٹریٹ نے مدھو سے پوچھا۔

"میں نے دھوکا نہیں دیا، میری یادداشت جاتی رہی تھی"

"یادداشت کب لوٹی ؟"

"پہلگام میں جب ریتا سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے میرے نام سے پکارا"

اب اگر ثابت ہو جائے کہ اس نے یادداشت کھو جانے کا ناٹک رچا تھا تو اسے دھوکا دہی کے الزام میں جیل بھیجا جا سکتا تھا۔

گرمیل اور انیس نے اس کے نریندر کے گھر رہنے پر اعتراض کیا اس لئے اسے ناری نکیتن میں بھیج دیا گیا۔ وہ خوشی سے چلی گئی جیسے اس کے لئے یہ بھی ایک تجربہ ۔۔ ایک نیا رول تھا۔

مدھو نے گرمیل اور انیس کے ساتھ اپنا بیاہ نہیں قبولا صرف اتنا کہا کہ ان کے ساتھ اس کا معاشقہ تھا۔ ان دونوں کو یہ ثابت کرنا تھا کہ بیاہ واقعی ہوا تھا۔

جب وہ لوٹ رہے تھے تو عدالت میں آئے تماشائیوں میں سے کسی نے بلند آواز میں یہ دوہا پڑھا۔

" رحیمن دھاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے پھر نہ ملے، ملے گانٹھ پڑ جائے "

بھدرسین ان سب باتوں کو قومی پس منظر میں دیکھتا اور تماشائیوں کے ردعمل اور پھبتیوں سے بھی حالات کا اندازہ لگاتا تھا۔

اس نے گرمیل اور انیس سے دو تین مرتبہ ذاتی طور پر ملاقات کی تاکہ ان کے خیالات سنے اور مقدمے کے بارے میں ان کے رخ کو سمجھے۔

نریندر اور سہگل سے بات چیت کا محض یہی ایک موضوع رہ گیا تھا۔ بھدرسین کے دماغ میں جو سوال اٹھتے تھے وہ ان پر صلاح مشورہ کیا کرتا تھا۔

" ڈاکٹر، میں تم میں ایک بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں " ایک دن سہگل بولا۔

" شکر ہے تم نے کچھ دیکھا تو سہی " بھدرسین نے مسکراتے ہوئے

اس کی طرف دیکھا۔

"دوڑ دھوپ تم بہت کرتے ہو۔ لیکن پہلے کی طرح پریشان بالکل نہیں ہوتے"

"میں جب اس واقعہ کا قومی اور بین الاقوامی بڑے بڑے واقعات سے مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے یہ بہت چھوٹا اور معمولی دکھائی دیتا ہے، میرے پریشان نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے" بھدرسین نے فلسفیانہ ڈھنگ سے جواب دیا۔

"یہ احساس شائد ابھی ہوا ہے؟" سہگل نے سوال بھدرسین سے کیا لیکن، دیکھا نریندر کی طرف، وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہا تھا۔

"احساس کافی دنوں پہلے ہو گیا تھا لیکن ہوا اس مقدمے کے دوران" بھدرسین نے حسب سابقہ جواب دیا۔

"کہاوت بھی ہے کہ آدمی ٹھوکر کھا کر سیکھتا ہے۔ خیر اب دوسرا سبب بتاؤ"

"دوسرا سبب؟" بھدرسین نے کرسی ذرا آگے سرکائی اور ذرا توقف کے بعد مضبوط آواز میں کہا "جب تک دیش میں موجودہ حالت بنی رہے گی ایسے واقعات ہوتے رہیں گے ان کا ہونا ناگزیر ہے۔ جسم میں گندا مواد ہو تو پھوڑے پھنسیاں ضرور پھوٹیں گی"

"ڈاکٹر پھوڑے پھنسیاں نہ ہوں گے تو آپ کے پاس مریض کہاں سے آئیں گے؟" سہگل ہنسا، لیکن نریندر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

"میری بات مذاق میں مت اڑاؤ، اسے سمجھو" بھدرسین نے انگلی ہلاتے ہوئے تنبیہ کی۔ "میں یہ بھی بتا دوں کہ ملک کی موجودہ حالت کے لئے ہمارا بایاں بازو ذمے دار ہے۔ اس میں تم بھی شامل ہو"

"ہیئر، ہیئر! ڈاکٹر آج خود تنقید کے موڈ میں ہے" سہگل نے ہلکے سے تالی بجائی۔

"بات تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں" نریندر دھیرے سے بولا۔

"تو تمہیں نئی نسل کی تائید بھی حاصل ہو گئی"

"وہ تو ہو گی، نئی نسل سچ کو جلدی پکڑتی ہے" بھدر سین نے کمر پشت سے لگا کر کرسی کا اگلا حصّہ اوپر اٹھایا۔

"ڈاکٹر، میری صلاح مانو۔ اپنے ان خیالات کو چھپوا دو، میں مذاق نہیں کر رہا۔ ایک دم ٹھیٹ زادہ میں اوریجنل ہیں"

"میں اوریجنل ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرتا، میرا خیال ہے کہ پورے دیش میں پھر سے غور ہو رہا ہے، قوم نے بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں"

وہ سہگل کے مکان پر بیٹھے تھے۔ اس کی پانچ چھ سال کی ننھی بچی، جس کا نام پپّی تھا، دوڑتی ہوئی اندر آئی اور ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "پاپا، پیسے دو، میں غبارہ لوں گی"

"پپّی، رہنے دو، دو منٹ میں پھٹ جاتا ہے"

"اوں ہوں، پیسے دو"

سہگل نے دس کا سکّہ بچی کو تھما دیا۔ وہ دوڑتی مسکراتی چلی گئی۔

"اچھا ڈاکٹر! مقدمہ تو لمبا چلے گا، عدالت سے باہر بھی اس کا کوئی حل ممکن ہے؟"

"عدالت سے باہر!" بھدر سین سوچ میں پڑ گیا، مگر کرسی کی پشت پر رکھے رکھے چند لمحے سوچتا رہا اور پھر ایک دم کمر سیدھی کر کے بولا "ممکن ہے"

"وہ بتاؤ" دیش کا مسئلہ تو جب حل ہو گا تب ہو گا، ہم اپنے اس مسئلے کو تو حل کر لیں"

"آج چھ تاریخ ہے؟"

"ہاں، چھ"

"اور مقدمے کی پیشی کب ہے؟"

"پندرہ کو" جواب نمبردار نے دیا۔

"اس بیٹھی پر فیصلہ ہو جائے گا۔ اس میچ میں انیس اور گرمیل کو یہاں، یا میرے مکان پر بلا بھیجئے۔ میں اپنی تجویز ان کے سامنے رکھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس سے متفق ہو جائیں گے۔"

"تجویز کیا ہے وہ تو بتاؤ؟" سہگل اور نریندر نے ایک ساتھ پوچھا۔

"پہلے ہی سے چرچا کر دینے سے بات کی اہمیت اور اس کا اثر کم ہو جاتا ہے میں اسی وقت سب کے سامنے بتاؤں گا۔" بھدر سین نے جواب دیا۔

طے پایا کہ وہ دس تاریخ کو سہگل کے مکان پر پھر ملیں گے۔ گرمیل اور انیس کو بھی بلا لیا جائے گا۔

کچھ دن پہلے پان سنگھ کو پھر بغاوت کا دورہ پڑا تھا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

"پان سنگھ لوٹا یا نہیں؟" بھدر سین نے چلتے چلتے نریندر سے دریافت کیا

"خیال ہے کہ اب وہ نہیں آئے گا۔ اس بار وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔" نریندر نے بتایا۔

"اسے کانگڑے کی دھرتی بہت دنوں سے بلا رہی تھی۔" بھدر سین نے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

---

(۱۷)

پانچوں آدمی سہگل کے مکان پر مقررہ وقت پر جمع ہوئے، بھدرسین کی تجویز جان لینے کے لئے سہگل بہت بے تاب تھا۔ اس لئے سب سے پہلے وہی بولا:

"ڈاکٹر، اب بتاؤ تمہاری تجویز کیا ہے؟"۔

بھدرسین نے ایک نظر انیس، گرمیل اور نریندر کی طرف دیکھا، لگا کہ وہ بھی تجویز سن لینے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس نے ذرا رک کر بات شروع کی:۔

"مقدمے کو ڈیڑھ برس ہوگیا۔ ابھی اتنا یا اس سے بھی زیادہ عرصہ اور، لگ سکتا ہے۔ اس لئے عدالت میں پریشان ہونے کے بجائے بہتر ہے آپ تینوں جنے اپنے اپنے نام پرچیوں پر لکھ کر لاٹری ڈالیں۔۔۔۔"

اس سے پہلے کہ بھدرسین اپنی بات پوری کرے اور اس پر گرمیل اور انیس اپنی رائے دیں سہگل کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"لاٹری کی تجویز بھی خوب ہے جس کے نام کی پرچی نکل آئے گی مدھو یعنی مینا اسی کی ہوگی"۔ ہنس لینے کے بعد اس نے بات پوری کی۔

"مجھے منظور ہے" نریندر نے اپنی رائے ظاہر کی۔

انیس اور گرمیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ عدالت مان جائے" انیس بولا۔

"بشرطیکہ یہ تجویز مینا کو بھی منظور ہو" گرمیل نے کہا۔

"مینا سے پوچھ لیا جائے گا" بھدر سین نے جواب دیا۔ اور پھر آگے کہا "رہی عدالت اس کا میری اس تجویز سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہمیں اسے بتانے کی ضرورت ہے"

پندرہ تاریخ کی پیشی پر انیس، گرمیل اور نریندر۔ تینوں کے دستخط سے مقدمہ واپس لینے کے کاغذات عدالت میں باقاعدہ داخل کر دیئے گئے اس کے بعد نریندر اور مینا اور ان کا وکیل پریم ناتھ چگ، انیس اور گرمیل اور ان دونوں کے وکیل چگ کے کمرے میں جمع ہوئے، بھدر سین اور سہگل بھی موجود تھے۔

طے پایا کہ انیس، گرمیل اور نریندر پرچیوں پہ اپنا اپنا نام لکھیں، ان تینوں پرچیوں کی گولیاں بنا کر اور ایک گلاس میں ڈال کر خوب ہلا دیا جائے پھر مینا یعنی مدھو گلاس میں سے ایک پرچی نکالے اس پر جس کا نام لکھا ہو وہ اس کے ساتھ چلی جائے۔

"تمہیں منظور ہے نا؟" چگ نے مدھو سے پوچھا۔

"ہاں منظور ہے" اس نے جواب دیا۔ اور اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر انیس، گرمیل اور نریندر کو باری باری دیکھا۔ جیسے وہ انھیں اب بھی بھرما رہی ہو۔

پریم ناتھ چگ نے ایک سائز کے تین کاغذ لئے اور ایک ایک انیس، گرمیل اور نریندر کی طرف بڑھا دیا تاکہ اس پر ہر ایک آدمی اپنا نام خود لکھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی، سہگل بھدر سین کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا

نریندر نے کاغذ لیا لیکن نام لکھنے کے بجائے اسے پُرزہ پُرزہ کر کے ہوا میں اچھال دیا۔

"یہ کیا ہے ؟"

سبھی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"جس عورت کو مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور جو کسی کے بھی ساتھ جانے کو تیار ہے مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ دونوں پرچیاں ڈالیں"

نریندر نے اپنے حریفوں سے کہا۔

گرمیل نے انیس اور انیس نے گرمیل کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا۔

"مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں"

"اور مجھے بھی نہیں"

انہوں نے کہا اور اپنی اپنی پرچیاں پُرزے پُرزے کر کے ہوا میں اچھال دیں۔

مردوں کو لبھانے اور انہیں اپنے بس میں رکھنے والی سمپورن ناری ان کے منہ دیکھتی رہ گئی!
